اشاعت اول
قیمت تین روپیہ کلدار
ناشر اُردو محل حیدرآباد دکن
مطبع دستگیری

۱۹۴۶ء
تعداد ۱۱۵۰

سول ایجنٹ
تاج آفس۔ محمد علی روڈ۔ بمبئی ۳

مسلم ضیائی کے نام ــــــ

چور بازار

ناول

تراشیدم

پرستیدم

شکستم

تعارف

از

کرشن چندر

جو لوگ ابراہیم جلیس کے افسانوں کے پرستار ہیں وہ ان کے ناول چور بازار کا ایک مدت سے انتظار کر رہے تھے۔ کم و بیش میں بھی اسی حالت میں تھا اور انتظار ساغر کھینچ رہا تھا۔ بارے ایک طویل مدت کے بعد ناول کا مسودہ ہاتھ آیا۔ پڑھ کر بڑی مایوسی ہوئی۔ اور میری طرح دوسرے احباب کو اسے پڑھ کر بڑی مایوسی ہوگی جو دن رات نون تیل لکڑی کا کھڑاگ الاپتے ہیں اور اپنی دانست میں یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ چور بازار رسد، راشن اور بلیک مارکٹ کے نازک اور پیچیدہ مسائل سے متعلق ہوگا اور ان تمام غذائی امور پر روشنی ڈالے گا جو جنگ کے مہلک اثرات نے ہمارے ملک میں پیدا کر دیئے ہیں یقیناً ایسے تمام احباب کو چور بازار پڑھ کر ناامیدی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ کیونکہ ابراہیم جلیس کے ناول میں اس چور بازار کا کہیں ذکر نہیں جس میں غلہ کپڑا اور زندگی کی

تمام ضروریات جھنگے داموں دستیاب ہوتی ہیں۔ اس ناول میں صرف
اس چور بازار کا ذکر ہے جس کا نام ہندوستان ہے۔

چور بازار ایک عجیب ناول ہے۔ اس کا ہیرو کوئی نہیں۔ اس کی
ہیروئین کوئی نہیں۔ اس میں کوئی خوبصورت مناظر نہیں۔ شیریں رومانیت،
نہیں خواب آور فلسفے نہیں جنھیں پڑھ کر قاری طربناک سپنوں میں کھو جائے
عشق کی افیم نہیں جسے چاندنی راتوں میں گھول کر پیا جائے۔ کوئی ایسی
نشاطیہ کیفیت نہیں جو ادبی کوک شاستروں اور نشیات کے استعمال سے
پیدا ہوتی ہے۔ اور جس کا چسکا اتنا بُرا ہوتا ہے کہ قاری کا ذہن پھر کسی
دوسری ادبی غذا کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ چور بازار نشہ آور نیند لانے والی
کتاب نہیں۔ جگانے والی کتاب ہے۔ اپنی تلخ ترین واقعیت کے
باوجود یہہ شام زندگی نہیں۔ نوید سحر ہے۔

چار کردار ایک جگہ مجتمع ہو کر اس ناول کو جنم دیتے ہیں۔ اس کی
ترتیب و تواتر میں حصّہ لیتے ہیں۔ اس کی تشکیل اور تخلیق میں اپنا
لہو دیتے ہیں۔ یہہ ناول ان چار کرداروں کے ملنے اور بچھڑنے کی
داستاں ہے۔ جب یہہ لوگ ملتے ہیں تو ناول وجود میں آتا ہے جب
یہہ لوگ جدا ہو جاتے ہیں تو ناول ختم ہو جاتا ہے۔ یہہ بیسویں صدی
کا قصّہ چہار درویش ہے۔ لیکن اس پہلے قصّے سے کس قدر مختلف۔
یہاں کوئی شہزادی نہیں۔ کوئی شہزادہ نہیں۔ سوداگر بچہ نہیں۔ ساقی،
گلفام نہیں۔ یہاں شروع سے آخر تک تلخی ہے۔ بے کسی ہے۔ نامرادی

ہے۔ ایک قوم کا نوحہ ہے۔ ایک ایسی نسل کی چیخ و پکار ہے جو ہماری آنکھوں کے سامنے بے قصور سنگسار کر کے دفنائی جا رہی ہے۔ وہ انفرادی المیہ تھا تو یہ اجتماعی مرثیہ ہے اس میں دھیما دھیما واعظانہ رنگ تھا تو اس میں پرشکوہ خطیبانہ انداز ہے۔

یہ چاروں کردار نوجوان ہیں۔ یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ دل میں شاداب آرزوں اور لہلہاتی ہوئی امنگوں کے باغ لیے ہوئے یہ طالب علم یونیورسٹی سے باہر نکلے ہیں۔ چاروں نچلے متوسط طبقے کے افراد ہیں۔ ماں باپ نے ان کی فرضی آسودگی کے لیے بلکہ ان کے دل و دماغ کی نشو و نما کے لیے تعلیم نہیں دی ہے انہوں نے اپنا پیٹ کاٹ کر انھیں پڑھایا لکھایا ہے تاکہ وہ فارغ التحصیل ہو کر اپنے کنبے اور اپنے گھر کی معاشی حالت بہتر بنا سکیں۔ اور خاندان کا نام روشن کر سکیں۔ ہندوستان میں خاندان کا نام علم و ہنر سے روشن نہیں ہوتا۔ سیمیں سکوں کے نور سے روشن ہوتا ہے۔ یہ لوگ بھی اسی روشنی کی تلاش میں اپنے کالجوں سے نکل کر ہندوستانی سماج کے چور بازار میں آئے ہیں۔ اپنی نوزائیدہ امیدوں کے دیے روشن کیے ہوئے لیکن اس چور بازار کا رنگ تو کالا ہے۔ یہاں تاریکی ہے۔ بھیانک اندھیرا ہے۔ ایسا اندھیرا جو صدیوں سے کم نہیں گہرا ہوتا جا رہا ہے۔ ابراہیم جلیس کا ناول ان جھلملاتے ہوئے دیوں اور اس گہری تاریکی میں کشمکش کی داستان ہے اور جب دیئے ایک ایک کر کے

سمجھتے ہیں تو جلیبس کا قلم روشنائی سے نہیں زہر سے لکھتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

ان چار کرداروں میں سے ایک ہندو ہے تین مسلمان یہہ چاروں ایک ہی جگہ رہتے ہیں۔ ایک ہی تھالی میں کھانا کھاتے ہیں۔ ایک ہی خواب دیکھتے ہیں۔ ایک ہی بات سوچتے ہیں۔ یہہ چاروں دوست ہیں غمگسار ہیں۔ مددگار ہیں۔ لیکن در اصل ان میں ہر شخص اکیلا ہے۔ کمینہ ہے۔ بےبس ہے۔ مجبور ہے۔ اپنی فطرت کے ہاتھوں، اپنے ذلیل جماعتی تضاد کے ہاتھوں جو اُسے مزدور سے نفرت کرنے پر مجبور کرتا ہے جو اسے کام کاج سے محنت سے جسمانی کوشش سے باز رکھتا ہے۔ یہہ کردار باتونی ہیں۔ جھکی ہیں۔ باتیں زیادہ کرتے ہیں۔ سوچتے اس سے بھی زیادہ ہیں۔ لیکن عملی کام کرنے کے لیے کبھی تیار نہیں ہوتے۔ انقلاب ان کے لیے ایک خوش آیند ذہنی تعیش ہے۔ ان کی بے عملی ان کی موت ہے وہ موت جو صدیوں سے ہندوستان کی روح پر مسلط ہے۔

چور بازار کا بنیادی اصول یہہ ہے کہ یہاں جو چیز بکنے کے لیے آئے وہ بہت سستی بکتی ہے۔ اور جو چیز بیچی جائے وہ بہت مہنگی فروخت ہوتی ہے۔ ہندوستان کی سماجی زندگی میں یہہ اصول ایک عرصے سے کارفرما ہے لیکن سرمایہ داری کے فروغ نے اس کی بنیادوں کو اور بھی مستحکم کر دیا ہے۔ یہہ چاروں نوجوان جو اس بھرے چور بازار میں کھڑے ہیں۔ بکاؤ ہیں۔ خریدار نہیں ہیں۔ خود جنس خرید ہیں۔ جب آدمی

بکتے ہیں تو انقلاب نہیں لاتے۔ اپنا ایمان لٹاتے ہیں۔ اپنی زندگی، اپنی عصمت، اپنی خوشی ـــــ انقلاب کا راستہ دوسرا ہے۔ یہہ راستہ چور بازار میں سے ہو کر نہیں گزرتا۔ اس راستے پر ظفریابی ممکن نہیں۔ ناکامی ہی ناکامی ہے۔

مہندر جس نے معصومیت چاہی تھی۔ آتشک زدہ ہے۔ ظفر جس نے عشق چاہا تھا۔ فریب خوردہ ہے۔ نوح جس نے اپنے باپ کی چھوٹی سی جاگیرداری کو نبھانا چاہا تھا ایک نئے طوفان نوح کا شکار ہو کر کلرکی پر قانع ہے۔ اور جلیل ـــــ ایک کسان کا بیٹا اپنی بیوی کے زیور بیچکر قرض چکاتا ہے اور آخر میں فوج میں بھرتی ہو جاتا ہے۔

یہہ لوگ کیسی کیسی عجیب باتیں کرتے ہیں۔ یہہ ناول پڑھکر مجھے ان پر بڑی ہنسی آتی ہے۔ کیسی غیر فطری، جاہلانہ، احمقانہ باتیں کرتے ہیں یہہ کردار ـــــ اپنی وِش فل تھنکنگ کے قلعے میں محصور، ایک عجیب ڈرامائی انداز میں اپنی معمولی سی زندگی کو دیکھتے ہیں۔ کسی ناٹک کے بادشاہ کی طرح ایک مصنوعی انداز میں چلتے پھرتے باتیں کرتے نظر آتے ہیں۔ یہہ جانتے ہوئے بھی کہ یہہ زندگی کچھ نہیں، یہہ تخت لکڑی کا ہے۔ یہہ مکان پرائے ہیں۔ یہہ زر و جواہر جعلی ہیں۔ پھر بھی ان پر جان دیتے ہیں۔ ایک ڈرامائی مصنوعی انداز میں سپنوں کی بادشاہت نچلے متوسط طبقے کے ہر نوجوان نے کی ہے۔ بادشاہ اور چور ـــــ اور چور بازار۔

ان لوگوں کی عقل ناپختہ ہے۔ ان کے اذہان خام ہیں۔ ان لوگوں سے عجیب عجیب حماقتیں سرزد ہوئی ہیں۔ اس عمر میں اس ماحول میں اس دیس میں کس سے نہیں ہوتیں۔ یہہ باتوں کے غازی کیا کچھ نہیں سوچتے اور کیا کچھ نہیں کر گزرتے۔ ان کے عزائم کتنے عجیب ہیں۔ یہہ لوگ محبت چاہتے ہیں۔ آسودگی چاہتے ہیں۔ آزادی چاہتے ہیں۔ کام کرنے کی آزادی، محبت کرنے کی آزادی، خوشی سے زندگی بسر کرنے کی آزادی، لیکن چور بازار میں آزادی کا کیا کام ——— ! یہاں تو غلامی بکتی ہے۔ یہی ان لوگوں کی سب سے بڑی حماقت ہے۔ یہی سب سے بڑا طنز ہے۔ اور طنز کی ساری تلخی اس کتاب پر ختم ہو جاتی ہے۔

چور بازار ان چار افراد کی داستان ہے جو تاریکی کا شکار ہوے۔ دراصل یہہ ایک ہی کردار کی داستان ہے۔ جس کے چار ٹکڑے کئے گئے ہیں ایک ہی قوم ایک ہی ملک کی کہانی ہے۔ جس کے چار قالب بنائے گئے ہیں۔ یہہ کردار ہندوستان ہے۔ یہہ ملک ہندوستان ہے۔ یہہ چور بازار ہندوستان ہے۔ اور یہہ ناول اس جانگداز حقیقت کی تفسیر ہے۔ کہیں کہیں واضح کہیں کہیں بہت مبہم ——— یہہ ناول نشان راہ ہے۔ منزل نہیں ہے۔ نہ قاری کے لیے اور نہ خود مصنف کے لیے۔

کرشن چندر
۱۲ر اگست سنہ ۴۵ء

اسمٰعیل باغ۔ ملاڈ
بمبئی

تراشیدم

یونیورسٹی کے باہر

یونیورسٹی کے پھاٹک سے ہمیشہ کے لیے باہر نکلا تو ایسا محسوس ہونے لگا جیسے پردیس سے پھر اپنے دیس آگیا ہوں۔ یونیورسٹی پردیس ہی تو ہے۔ ایک پردیسی زبان، پردیسی تہذیب، پردیسی آداب اخلاق اور پردیسی علوم وفنون کا گہوارہ .... اب طامس مور کی خیالی دنیا، ملٹن کی فردوس گم گشتہ اور ورڈز ورتھ کی لیک لینڈ سے نکل کر اپنے دیس کی اس بھوری، کھردری زمین پر چل رہا ہوں تو ایسا عجیب معلوم ہو رہا ہے جیسے اس سرزمین پر چل ہی نہ سکوں گا۔ بھلا جس نے ساری عمر ورڈز ورتھ کے ساتھ برفیلے پہاڑوں کی سیر کی ہو۔ چارلس لیمب کے ہمراہ لندن کی آراستہ پیراستہ گلیوں کے چکر کاٹے ہوں، موپاساں کی معیت میں پیرس کے ریستورانوں، ناچ گھروں، شراب خانوں اور قحبہ خانوں میں لمحاتِ عیش گزارے ہوں۔ کیٹس اور شیلے کے ساتھ سنہری بالوں اور نیلی آنکھوں کا جمال دیکھا ہو اور جس کے منہ میں شکسپیئر کی زبان ہو ــــــ بھلا اس کو یہ بے ڈھنگا، ویران اور اجڑا اجڑا

دیس کیسے پسند آسکتا ہے؟ کالی زلفوں اور کالی صورتوں کو دیکھ کر نظر کا انداز
برہم ہو جائے تو کیا تعجب ہے۔ اردو، کنڑی، مرہٹی، گجراتی کی ثقالت سے
سماعت میں جھنجھلاہٹ پیدا ہو تو کیا حیرت ہے ــــ!
مگر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے اور دل ناچ رہا ہے کیونکہ بچپن سے
جوانی تک پورے چودہ برس بعد اپنے والدین، اپنے بھائی بہنوں اور
اپنی .... اپنی منگیتر فاطمہ سے ملنے جا رہا ہوں۔ وہ سب اسی
ٹیڑھی بھینگی پگڈنڈی پر نظریں بچھائے آج میرا انتظار کر رہے ہیں۔ جب
میں پردیس کا یہ تحفہ ـــــ یہ بی۔ اے کی ڈگری انہیں دکھاؤں گا تو
میرے بوڑھے باپ کی ایک ایک جھری میں مسکراہٹ بھر جائے گی
وہ میری ڈگری لیے سینہ تانے، مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا باہر بیٹھک میں
چلا جائے گا۔ رفیع الدین، راجہ راؤ، حیدر علی اور کرم چند سب کو جمع کر کے
میری بی۔ اے کی ڈگری دکھائے گا تو وہ ایک احساس کمتری سے
میرے باپ کی فتحمند مسکراہٹ کو دیکھیں گے اور دل ہی دل میں اپنے
ناخلفوں کو کوسیں گے جو کھیتوں میں ہل چلا رہے ہیں۔ سو د اسلف
کی دوکانوں پر نوکر ہو گئے ہیں یا شہر بھاگ گئے ہیں۔ میرے
استقبال میں گھر میں بریانی اور زردہ تیار ہوگا اور فاطمہ ....!
اس نام سے زبان کیسا چٹخارہ بھرتی ہے! اب تک ایسے لطیف نام
کہاں آئے تھے زباں پر؟ ظفر، مہندر، نوح، جوگندر ایسے ایسے
کرخت ثقیل ناموں کے بعد فاطمہ ــــ بخدا زبان کا مزہ بدل گیا

خدا کرے کہ اس کا نام جتنا میٹھا اور دلاویز ہے۔ اس کا چہرہ مہرہ بھی ویسا ہی دلاویز ہو۔ اس کے ہونٹوں میں بھی وہی مٹھاس ہو۔ بہت بچپن میں میں نے اسے دیکھا تھا۔ مخمل کا جاکٹ سپید چکن کا لمبا کرتا اور رہرو کا پاجامہ پہنے ہوئے۔ جب اس کے گالوں میں گلاب کی کلیاں تھیں۔ اب وہ کلیاں کھل کر پھول بن گئی ہوں گی۔ آنکھوں میں ستارے آ گئے ہوں گے بہت لمبی ہو گئی ہو گی۔ زلفوں میں پیچ و خم پیدا ہو گئے ہوں گے۔ پلکوں میں شرمیلا جھکاؤ۔ اور رگ رگ میں لہو کے فوارے جو بات بے بات اس کو سرخ کر دیں۔ اس کو دیکھکر میں اپنے اس مغربی پروفیسر کی ایسی لڑکی کو نہ بھول جاؤں جس کے ہونٹوں نے مجھے پہلی بار دعوت کا مزا چکھا دیا تھا۔

پگڈنڈی ایک چوڑی چکلی سڑک میں گم ہو گئی۔ فاطمہ کے تصور میں میں اپنے قدموں تلے پیچھے ہی پیچھے بھاگتی ہوئی پگڈنڈی کو بالکل ہی بھول گیا تھا۔ اچھا ہی ہوا ورنہ پگڈنڈی کے یہ پیچ و خم تھکا تھکا کر مار ہی تو ڈالتے مگر میں یہ کہاں —— کس ویرانے میں آ گیا —— سڑک کے دونوں طرف ٹوٹے پھوٹے مکان، بوسیدہ دیواریں، گھوڑے، کھنڈر، قبرستان، سناٹا، سکوت، خموشی —— ان مکانوں کے مکین کہاں گئے؟ وہ تاج محل کہاں ہے جس نے ہندوستانی حسن کو دوام عطا کیا۔ وہ گوکل کے چھوکرے بنسری کیوں نہیں بجاتے —؟ گوپیاں کیوں نہیں ناچتیں ——؟ میرے دیس کی سرحد تو شروع ہو گئی ہے!

چھم چھم ...... چھم چھم۔ کوئی سندر ناری آ رہی ہے۔ شاید

کوئی گوپی میرے استقبال کو آرہی ہے۔ میں نے اپنی نکٹائی کی گرہ ٹھیک کی اور رومال سے چہرے کی گرد صاف کی۔ اور دل کے ناچ میں البیلا پن پیدا ہوگیا۔

ایک پیسہ دیدو بابوجی ——— ایک پیسہ

میری نظروں کے سامنے ایک نوجوان لڑکا ایک ہاتھ میں بنسری اور دوسرے میں کشکول لیے ہوئے تھا۔ اور اس کے پہلو میں ایک نوخیز سانولی لڑکی اپنا میلا دوپٹہ پھیلائے کھڑی تھی۔ یہہ بنسری بجا کر پیسہ مانگنے والا شیام! اور یہہ دوپٹہ پھیلا کر بھیک مانگنے والی رادھا!

"شٹ اپ یو فولس"

میں نے اپنی نکٹائی کی گرہ ڈھیلی کرلی۔ اور ایک چونی لڑکی کی طرف پھینکی جو غلطی سے پھیلے ہوئے دوپٹے کے پلو میں گر گئی۔ جس کو دیکھ کر ایک چھدری سپید داڑھی والا بوڑھا میری طرف لپکا۔ مسکراتا ہوا کھسیاتا ہوا۔ سر کھجاتا ہوا۔۔۔۔۔

حجور۔ وہ لڑکی آپکو پسند ہے۔ ارے۔ وہ تو کچھ بھی نہیں۔ آپ نے بیکار میں اسے چونی دیدی۔ اس سے تو میری لاڈلی بیلا لاکھ درجے اچھی ہے اور اس کی طرح بیمار بھی نہیں"۔

میں چلتے چلتے یکایک رک گیا۔ جیسے پیروں نے جواب دیدیا ہے اور اب آگے چلنے کی توانائی نہیں ہے یا اب آگے جانے کی ضرورت

نہیں ہے۔ یہ بوڑھا کیا کہہ رہا ہے اور میں کیا سن رہا ہوں؟ میرے
سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت کس نے سلب کرلی ہے۔؟ میں نے اس
بوڑھے کو بُری طرح دھتکار دیا اور پھر چلنے لگا۔ اب رفتار میں اضمحلال
تھا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ نہ تھی۔ دل اپنا ناچ بھول گیا تھا۔ مجھے
ان مورخوں پر غصّہ آگیا جنھوں نے لکھا ہے کہ ہندوستان میں سیتا جیسی
ساوتریاں پیدا ہوئیں جنھوں نے لکھا ہے کہ ہندوستان مہاتماؤں
رشیوں، سادھوؤں اور راجاؤں کا ملک ہے۔ مجھ پر ان شاعروں کا
جھوٹ عیاں ہوگیا جنھوں نے بتایا تھا کہ یہاں کی عورت میں سیتا دیوی
کا روپ ہے ——— سیتا دیوی! اب شاید صرف سیتا رہ گئی
ہے اور دیوی اس کے قالب سے نکل کر ہمالے کے پہاڑوں کے پیچھے
بھاگ گئی ہے یا جلتی ہوئی چتا کے دھوئیں میں تحلیل ہوکر افلاک میں
جذب ہوگئی ہے۔ اب صرف سیتا رہ گئی ہے یا رادھا! جو ہر اس
"شیام" کے سامنے ناچتی ہے جو اس کے دوپٹے کے پلو میں ایک
چونّی پھینک دیتا ہے۔ ابھی ابھی میں نے ایک رادھا کے آنچل میں ایک
چونّی پھینکی تھی۔ دم کے دم میں مجھے چھ سات رادھاؤں نے گھیر لیا

------ چھم چھم ------ چھم چھم ------

مجھے بنسری بجانا تو نہیں آتا پھر میرے گرد یہ رادھائیں کیسے ناچنے لگیں؟

میرے دیس کے پہلے نظارے۔ پھیلے پھیلے میلے میلے دوپٹے اور بھیک
کے کاسے! میرے دیس کی پہلی آوازیں۔ ایک پیسہ! ایک روٹی لین بو

اور انفنٹری کی تاریخوں میں کتنا جھوٹ بھرا ہے۔ کولار میں سونے کی کان ہے۔ گولکنڈے میں ہیرے نکلتے ہیں۔ دو آپے کے کھیت ساری دنیا کی بھوک مٹا سکتے ہیں!۔

ہوسٹل کی کھڑکی سے میں یونیورسٹی کے افق کو کتنی امید بھری نظروں سے دیکھا کرتا تھا۔ اس افق کو پار کرنے کی تمنا کتنے عرصے سے میرے دل میں پرورش پا رہی تھی۔ اب وہ خواب ٹوٹ گیا ـــ افق صرف ایک دھوکا ہے۔ میرا دیس صرف ایک کھنڈر ہے۔ میں جس راستے پر چل رہا ہوں اس کی ویرانی کو دیکھ دیکھ کر مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس راہ سے کئی لشکر گزرے ہیں۔ سکندر اعظم کا لشکر محمود غزنوی کا لشکر، بابر کا لشکر کلائیو کا لشکر!۔ میرا جی چاہتا ہے کہ الٹے پاؤں لوٹ جاؤں۔ پھر سے یونیورسٹی کی کھلی کھلی مسرور فضا میں کھلکھلاتی ہوئی زندگی کے سینے سے لپٹ جاؤں۔ ہوسٹل کے آباد کمروں میں اس ویرانے کو بھول جاؤں۔ سوئمنگ باتھ لان پر لیٹ کر ہرے لال نیلے پیلے پھولوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر اپنے دیس کی بدصورتی کو یاد نہ آنے دوں۔ بوٹانیکل گارڈن کی ہریالی پر لیٹے لیٹے رات رات بھر چاندنی میں نہاتا رہوں۔ بیٹھے بیٹھے خواب دیکھوں ـــ ایسے خواب جو نیند میں بھی میرے ہونٹوں کو متبسم کر دیں۔

”آداب بھیا جی ـــ کب آئے“

ایک بوڑھا تھا۔ میں نے تو اس کو نہیں پہچانا۔ شاید اس بوڑھے

کے بھی کوئی لاڈلی بیلا ہوگی۔ چونی مانگتا ہوگا بیچارا!

"اوہو ——— جلیل تم آگئے"

ایک دوکان پر سے میرے چچا اتر آئے۔ مجھے گلے سے لگالیا۔ گلے لگاتے وقت ان کے محنتی جسم کی بو اور پسینے سے تر بتر کپڑوں سے مجھے گھن آگئی۔ ہوسٹل کی سینٹ اور لونڈروں سے معطر فضا میں ایسی ناگوار بو کبھی کاہیکو سونگھی ہوگی! وہ فرما رہے تھے۔

"بھیا تو سویرے سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ بھابی نے تو صبح سے کھانا بھی نہ کھایا۔ کہتی تھیں کہ میں تو آج اپنے لال کے ساتھ ہی کھاؤنگی"۔

لال ——— اس نام نے میرے دل میں بڑی مزیدار گدگدی سی پیدا کردی۔ میں اس نام کو دوبارہ سننا چاہتا تھا۔ مجھے اس وقت بڑا سرور آتا ہے جب کوئی میرے دل کو گدگداتا ہے۔ لال ——— کتنا پیار بھرا ہے اس نام میں۔ میری تو تمنا ہے کہ مجھے جاننے پہچاننے والے سب میرا اصلی نام بھول جائیں اور مجھے اسی نام سے پکارا کریں۔ اور میرے دل میں ہر لحظہ، ہر لمحہ ہر ساعت گدگدیاں ہوتی رہیں۔

پھر میری آنکھوں کے آگے ایک دروازہ کھلا۔ یہ دروازہ میری زندگی کا دروازہ ہے۔ آج سے پندرہ سال پہلے اس کی دہلیز کو اپنے ننھے ننھے قدموں سے پار کرکے میں سارے گاؤں میں، ہرتی پھرتی گلیوں اور پھر دھرتی کی شہرگ کی طرح پھیلی ہوئی سڑک پر چل کر دیس سے

یونیورسٹی چلا گیا تھا۔ آج پھر اسی دہلیز کو پار کر کے اس گھر میں داخل ہو جاؤں گا۔ جہاں ایک تنگ سے کمرے میں مجھے زندگی عطا ہوئی تھی۔ جہاں میرے پھیپھڑوں میں پہلی سانس داخل ہوئی تھی۔ میں اس جنت کو دیکھوں گا جو میری ماں کے قدموں تلے آباد ہے ——
مجھے اپنا وہ ہندو دوست یاد آتا ہے جو تعلیم کو تیاگ کر ایک پہاڑی پر بے آب و دانہ چھ مہینے سے بیٹھا جنت کی تلاش میں کڑی کڑی ریاضتیں کر رہا ہے۔ وہ بیوقوف اپنے گھر کیوں نہیں چلا جاتا —— ؟ اپنی ماں کے چرنوں میں کیوں نہیں جھک جاتا —— ؟

"اوہ —— بیٹا تم آ گئے"!

یہ میرے باپ کی آواز تھی۔ مجھے اپنے باپ کو پہچاننے میں تامل ہونے لگا۔ مونچھیں سپید، کنپٹی کے بال سپید، چہرہ سپید —— شاید خون بھی سپید ہو گیا ہو!

"ارے سنتی ہو۔ تمھارا لال آ گیا۔

ایک کمزور آواز —— بلکہ چیخ سنائی دی۔

"آ گیا میرا لال —— اللہ تیرا شکر ہے۔ میرا لال آ گیا۔ ارے ادھر تو آ —— میرے لال۔ دیکھ تو میں تیرا کب سے انتظار کر رہی ہوں ——"۔

میں گم سم آنکھیں پھاڑے سامنے کھاٹ پر پڑے ہوئے ہڈیوں کے ڈھانچے کو دیکھ رہا تھا جو اپنی سوکھی سوکھی کمزوری سے لرزتی ہوئی

باہنیں پھیلا کر مجھے اپنی طرف بلا رہا تھا۔

"آ میرے لال ـــــ میرے قریب آ۔ کتنا بڑا ہو گیا کتنا جوان ہو گیا تو ـــ آ۔ میں تیرا منہ چوم لوں۔ میرے لال"۔

میرے لال ـــــ مگر میرے دل میں گدگدی کیوں نہیں ہو رہی ہے؟ اس بوڑھی عورت کی جھریوں میں کھنڈی ہوئی ہلدی سے میری آنکھیں پتھرائی جا رہی تھیں۔ میں نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے اس ہڈیوں کے ڈھیر کو گلے سے لگا لیا۔ میرے ارد گرد بہت سے چھوٹے چھوٹے ننگے دُبلے سوکھے مریل سے بچے اور بچیاں جمع تھیں۔ پسینہ کی بُو اور میلے کپڑوں کی سڑاند سے میری طبیعت مالش کر رہی تھی ـــــ توبہ ـــ کتنا پسینہ بہاتے ہیں میرے دیس کے لوگ!

بچے شور مچا رہے تھے۔ بھیا آ گئے ـــــ بھیا آ گئے۔ اور اس کان کے پردے پھاڑ دینے والے شور کے باوجود میں کچھ نہیں سن رہا تھا۔ اپنے ناخن دانتوں سے کاٹتا ہوا کمرے کے اندھیرے میں جانے کیا دیکھ رہا تھا۔ اس اندھیرے میں یکایک چوڑیاں بجیں۔ چوڑیوں کی ایسی جھنکار صرف جوان کلائیوں ہی سے پھوٹ سکتی تھی۔ میں نے بیتاب ہو کر ادھر دیکھا۔ پہلو کے دروازے پر ایک پھٹی پھٹی چلمن پڑی تھی۔ اور اس میں سے ایک جوان مگر مرجھایا ہوا چہرہ جھانک رہا تھا۔ اس کے رخسار پیلی پیلی ناشپاتیوں کی طرح سوکھ رہے تھے ـــــ یہ کیا

بخیل مصور ہے جو اپنی تصویروں کو صرف دو ہی رنگوں میں رنگ رہا ہے سپید اور پیلے ـــــ برف اور ہلدی۔ مجھے پیلے رخسار مطلق پسند نہیں میں تو سرخ رخساروں پر جان دیتا ہوں۔ ایسا ہی سرخ رنگ جو ہندوستان کے نقشے پر برطانوی تسلط کو ظاہر کرتا ہے۔ مگر ہندوستان میں تو جیسے سرخ رنگ بالکل مفقود ہے۔ شاید ہندوستانیوں کے جسموں کا سارا لہو نقشے پر پھیلا دیا گیا ہو۔ میں نے فاطمہ کی آنکھیں نہیں دیکھیں۔ صرف اس کے پیلے پیلے رخسار دیکھ رہا تھا اور ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے کوئی بڑا ہی سہانا خواب ایک بہت ڈراونی چیخ پر ختم ہونے والا ہے۔

ماں اپنے سکڑے ہوئے ہونٹوں کو ایک زبردستی کی مسکراہٹ سے پھیلا رہی تھی۔ اور میں اس کی پیشانی پر اپنا گال رکھے رو رہا تھا اس کو لال مل گیا تھا ـــــ گدڑی کا لال۔

ماں ایک مہینے سے بیمار تھی۔ بغیر کسی دوا دارو کے کھانس کھانس کر خون تھوک رہی تھی۔ چارپائی کے نیچے اس کے بہتر کا اگالدان خون سے بھرا تھا ـــــ کیا مہینہ میں ہیں پیاک دان اسی لیے دیے جاتے ہیں کہ عورتیں اپنے رخساروں کا سارا خون ان میں تھوک دیں۔؟

ـــــ مگر فاطمہ کی تو ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ اس نے اپنے رخساروں کا خون کہاں پھینک دیا ـــــ یہ ہولی کہاں کھیلی جارہی ہے اور وہ کون سفاک ہے جو ان نازک کومل عورتوں کے لہو

سے اپنی پچکاریاں بھر بھر کر لیجا رہا ہے ۔۔۔۔۔ ظالم ــــــ وحشی ۔ سنگدل ۔

میں نے فاطمہ سے پوچھا کہ ماں کو آٹھ دن سے دوائی کیوں نہیں دیگئی ۔ اس کے کپکپاتے ہوئے ہونٹوں سے ایک لرزتی سانس بولی ۔

روپیہ ــــــ؟

باپ نے تجھے پچاس روپے گیبرڈین کا سوٹ سلوانے کو بھیجدیئے ۔ اور میری ماں کے لیے دوائی تک نہ خرید سکے ۔ بچے پیدا ہونے کے بعد باپ کو ماں کی ضرورت ہی کیا ہوتی ہے ــــــ ؟ وہ تو اس سے صرف بچے چاہتا ہے ۔ جو اتنے بڑے انسان بن جائیں کہ تجوریوں کی تجوریاں روپوں سے بھر دیں اور باپ ہر ایک کے آگے سینہ پر ہاتھ مار کر فخر کرے ــــــ پسرم سلطان است یہہ باپ ــ ایہہ مرد ــ ! ہر مرد شوہر سے زیادہ باپ بننے ہی کی تمنا دل میں رکھتا ہے ۔ اسی لیے میں نے آج تک کبھی نہیں سنا کہ کسی مرد نے کسی بانجھ عورت سے محبت کی ہو ۔

اس ہڈیوں کے ڈھیر، میلے کپڑوں کی سڑانڈ، سوکھے مریل دبلے بچے، نجاست، گندگی، کثافت اور رونے کا شور، کالی بوسیدہ دیواریں نیچی چھت گھٹی گھٹی فضا کو دیکھ کر مجھے کال کوٹھڑی یاد آتی تھی ۔ کون کہتا ہے کہ اس دیس میں صرف ایک ہی کال کوٹھڑی ہے ۔ یہاں کا ہر گھر ایک کال کوٹھڑی ہے ــ میرا گھر دیکھو ــ میرے پڑوس کا

گھر دیکھو۔ پڑوس کے پڑوس کا گھر دیکھو ـــــ میرا سارا دیس کال کوٹھری ہے جس کی گھٹی گھٹی فضائیں موت ہی موت بسی ہے۔ یہاں یونیورسٹی کی سی زندگی بخشنے والی ہوائیں کہاں ـــــ سائنس میں موسیقی کہاں ـــــ؟ نہ یہاں جمیل کی طرح کوئی قہقہے لگانے والا ہے اور نہ رضوان کی طرح میٹھے میٹھے گیت گانے والا۔ نہ ظفر کی طرح کوئی نقلیں اُتارنے والا ہے۔ نہ مدھوسودن کی طرح کوئی کہانیاں سنانا ہے ـــــ یہاں تو بس صرف دو ہی چیخیں سُنائی دیتی ہیں ـــ بھوک ـ پیسہ ـ دو ہی رنگ دکھائی دیتے ہیں۔ سپید ـ پیلا ـــــ برف اور ہلدی ـ

ماں کو دوا کیوں نہیں دی گئی ؟

روپیہ نہیں تھا ۔"

فاطمہ کے رخسار پیلے کیوں ہیں ؟

وہ عرصے سے کنواری بیٹھی ہے ؟

یہ بچے اتنے سوکھے مریل کیوں ہیں ؟

انھیں بھوک لگی ہے ۔"

گاندھی نے برت کیوں رکھا ؟

ہندستان مانگتا ہے ـ

جناح کیوں چیختا ہے ؟

پاکستان مانگتا ہے ـ

سب ہاتھ پھیلائے کچھ نہ کچھ مانگ رہے ہیں۔ بھکاری۔ اور میں
جیسے خواب دیکھ رہا ہوں۔ ہندستان راجاؤں مہاراجوں کا ملک ہے۔
عالیشان محلوں کی سرزمین ہے۔ سونے اور چاندی کا معدن ہے ـــــ
ہیروں اور موتیوں کی کان ہے ـــــــ میں خواب دیکھ رہا ہوں۔
میں جرم کر رہا ہوں۔ نہ بہادر شاہ ظفر بزدل تھے اور نہ میر جعفر غدار تھا۔
بلکہ سارا قصور انہی خوابوں کا ہے جو ایک دوسرے منسلک ہو ہو کر پورے
سو سال سے نیند کی زنجیر لمبی ہی لمبی کھینچتے جا رہے ہیں۔

آہ اور واہ

فاطمہ کے پیلے پیلے رخساروں سے کچھ ایسی زردی پھوٹتی تھی کہ میرے چہرے کی سرخیاں بھی رفتہ رفتہ ایک مہلک قسم کی زردی میں گم ہو گئیں ـــــ پیلا، اداس، مضمحل، تھکا تھکا ـــــ گاؤں کے باہر کھیتوں میں، پہاڑیوں کی کھوؤں میں، درختوں کی چھاؤں میں بیٹھے لیٹے کتابیں پڑھتے، خطوط لکھتے، سگریٹیں پیتے، اونگھتے سوتے دن گزار رہا تھا جیسے اب زندگی صرف اس لیے رہ گئی ہے کہ دن گزارتے جاؤ۔ میرے باپ کو تعجب تھا کہ یہ مجھے کیا ہو گیا ہے کہ میری زندگی بالکل گم صم ہو گئی ہے۔ ایسی ہی گم صم جیسے فاطمہ کے ہونٹ۔

ایک ٹھنڈی شام پہاڑی نالے کے کنارے ایک چٹان پر بیٹھا سورج کی نیم گرم کرنوں سے اپنے کپکپاتے ہوئے جسم کو حدت پہنچا رہا تھا کہ ایک لڑکی نہ ہوتی نہ دبلی نہ بہی نہ نازی۔ گوری گلابی جیسے اس کا خمیر لال مٹی ہے۔ کمر پر گاگر رکھے۔ چلنے کے بجائے ناچتی ہوئی گانے کے بجائے گنگناتی ہوئی۔

اس طرح ناز جیسے کوئی ڈولتی ہوئی
ابرو کے بل سے دل کی گرہ کھولتی ہوئی

تلوار سی ہر ایک لچک تولتی ہوئی
گاتی ہوئی ادائیں نظر بولتی ہوئی

زلفوں کے پیچ و خم میں لیے موج آبشار ــــــــ نالے میں اترتی نظر آئی۔ سارے گاؤں میں یہ پہلی لڑکی میں نے دیکھی تھی جس کا لہو اس کے رخساروں میں ابھی محفوظ تھا۔ جس کی آنکھوں کے ستارے ٹوٹے نہ تھے۔ بڑی مدت بعد پھر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ سورج کی نیم گرم کرنوں نے میرے تحت الشعور میں ایک لطیف سی جھرجھری پیدا کی اور بیٹھے ہی بیٹھے میرا تنفس تیز ہو گیا ــــــــ میں آہستہ آہستہ پہاڑی سے نالے کے ڈھلوان پر اتر آیا۔ اور برگد کی ایک نچلی شاخ پر کہنیاں ٹیک کر اس کو ایسی نظروں سے دیکھنے لگا جیسے میری نظروں کی ساری بھوک اور پیاس یہ سُندر سُندر مکھڑا بجھا دے گا جب وہ اپنی گاگر بھر کر ندی سے باہر نکل آئی تو مجھے دیکھ کر ٹھٹکی۔ میری نظروں کی زنجیر نے جیسے اس کی چال میں ایک ٹھٹک اور جھجک پیدا کر دی تھی۔ اس کے کانوں میں بیشمار گلاب کے پھولوں کی سرخ سرخ پتیاں کانپ رہی تھیں اس کا راستہ جلد ہی ایک گھنی گنجان جھاڑی میں اوجھل ہونے والا تھا۔ اس لیے میں نے اسے پکار لیا۔

"اے سنو ــــــــ مجھے پیاس لگی ہے۔ پانی پلاؤ گی؟"

اس نے پلٹ کر دیکھا اور مسکرا دی۔

"دو قدم پرے ہی تو اتنی بڑی ندی بہہ رہی ہے۔ وہاں

کیوں نہیں پی لیتے ؟ ۔ گاگر میں بھی تو وہی پانی ہے۔"
میں نے مسکراہٹ میں گھلے ہوئے اس میٹھے جواب کا مسکراہٹ ہی
میں گھول کر جواب دیا۔
"تم نہیں جانتیں ۔ گاگر میں آنے کے بعد پانی کچھ اور ہی
ہو جاتا ہے ۔ یوں سمجھو جیسے آسمان کے کناروں پر جو لالی
پھیلی ہوئی ہے وہ کسی لڑکی کے گالوں میں سما جائے تو ۔ ۔ ۔ ۔"
"بس بس ــــــ میں سمجھ گئی ۔ لو پانی پیو۔"
میں نے چلو پھیلاتے ہوئے پوچھا ۔
"تمھارا نام ــــــــ ؟"
بے جھجک وہ بولی ۔
"بیلا"
میرے چلو سے سارا پانی گر گیا ۔ آنکھیں حیران ہو کر اس کو دیکھنے لگیں
"کیوں ۔ گھبرا کیوں گئے ؟"
میں نے اٹھتے ہوئے کہا ۔
"پیاس بجھ گئی ــــ"
وہ بے اختیار کھکھلانے لگی ــــ واہ واہ ۔ بجھ گئی پیاس ۔
اس کے قہقہے سنسان جنگل میں گونجنے لگے ــــ مدھم ہونے لگے ۔ وہ اٹھلاتی
لچکاتی، مڑ مڑ کر میری طرف دیکھتی پگڈنڈی کے ایک گھنے گھنے خم میں کھو گئی ۔
مدھم ہو کر اور زیادہ رسیلے ہوتے ہوئے قہقہے ابھی تک سناٹے میں کھِل کھِل

کھِل، گونج رہے تھے۔ بیلا ——— اس گاؤں میں پہلے ہی دِن جب میں داخل ہوا تھا تو ایک بوڑھے نے کہا تھا ——— اس بھکارن سے تو میری لاڈلی بیلا لاکھ درجہ اچھی ہے۔ اس کی طرح بیمار بھی نہیں "۔ واقعی بیلا اُس بھکارن سے لاکھ درجے اچھی تھی۔ اور بیمار بھی نہیں۔ اور بیمار ہو بھی نہیں سکتی۔ کتنی بہت سی چونیاں مل جاتی ہونگی اس کو ایک ایک دن میں !

اب چاہے دو آبے کے کھیت جھلس جائیں۔ کولار کی سونے کی کان بانجھ ہو جائے۔ گولکنڈے کی کوکھ خالی ہو جائے۔ بیلا کے گالوں میں شہابی روئیں رنگیتی ہی رہیں گی۔ اس کے جھومر میں ہیرے جگمگاتے ہی رہیں گے وہ کھِل کھلاتی ہی رہیں گی ——— کھِل کھِل کھِل کھِل - - - - - - -

مگر فاطمہ کیوں نہیں مسکراتی ——— ؟ فاطمہ کا گلا تو بیلا سے زیادہ پتلا لمبا گداز ہے۔ اس کے گلے میں گونج کر پھوٹتی ہوئی ہنسی تو بہت زیادہ رسیلی ہوگی ——— کھِل کھِل جیسی کھوکھلی ہنسی کے بجائے کھِن کھِن جیسی جھنجھناتی ہوئی ہنسی ———

جب میں شام کو گھر لوٹا ——— تو اچانک فاطمہ کو مسکراتے ہوئے دیکھ لیا ——— پہلی بار اس کے موتیوں جیسے دانت چمکتے دیکھے وہ دالان میں دھان کوٹتی آپ ہی آپ ہنس رہی تھی ——— اور میری معصوم سی بہن کو چھیڑ رہی تھی ——— میری آہٹ پاکر وہ کچھ ایسی گھبرا گئی کہ گرتی پڑتی اندر کوٹھری میں بھاگ گئی۔ دہلیز کی ٹھوکر کھاکر وہ اوندھے مُنہ گری بھی ———

لیکن کیوں۔؟ آج اس کی زلفیں ہمیشہ کی طرح پریشان بھی نہ تھیں
——— کیوں۔؟ آج پہلی بار میں نے اس کی زلفوں کے اندھیرے
میں کہکشاں کی طرح دمکتی ہوئی سپید چمکیلی مانگ دیکھی تھی جو اس کے
اودے ڈوپٹے میں چھپ گئی تھی ——— جیسے میری زندگی کا
ہر چمکیلا دن رات کے اندھیرے میں چھپ جاتا ہے۔ میں اپنی ماں کے
کمرے میں گیا۔ بیماری کے آخری بستر پر لیٹے رہنے کے باوجود وہ میری طرف
دیکھ کر مسکرا رہی تھی ——— یونیورسٹی کے سینما میں میں نے بالکل ایسی
ہی ایک فلم دیکھی تھی۔ میں سب کچھ سمجھ گیا۔ ہندوستانی مائیں صرف
دو ہی کام کرنا جانتی ہیں ——— ایک بچے پیدا کرنا اور دوسرے
مرنے سے پہلے ان کے سہاگ کے پھول سونگھ لینا۔
میں گھبرا کر باہر چلا گیا۔ جی چاہتا تھا کہ پھر پہاڑی پر اپنی اسی
پسندیدہ چٹان پر جا بیٹھوں جہاں روز بیٹھا کرتا تھا۔
یا خوب روؤں یا ٹھٹھے مار مار کر ہنسوں۔ یا اس وقت من میں جو کچھ
سمائے وہی کرتا رہوں ——— لیکن باہر بیٹھک سے میرے ابا کی
دبی دبی آواز کو ایک موٹی غصیلی بھدی آواز دبا رہی تھی کہ
"دیکھو بیٹا ——— رقم پانچ سو سے بھی زیادہ ہو گئی ہے
اب اور دو سو تو میں دے نہیں سکتا۔ پچھلا پہلے بیباق کردو
پھر دیکھا جائے گا۔"
ابا کی آواز میں گڑگڑاہٹ ملی تھی۔

" فکر نہ کرو لالہ ـــــ اگلا پچھلا سب بیباق ہو جائے گا۔ جلیل نے بی۔ اے پاس کر لیا ہے۔ کل کو کوئی بڑا افسر بن جائیگا پھر تمہارے اِن مقدموں کو جو شہر کی کچہری میں چل رہے ہیں یوں چٹکی بجاتے فیصل کرا لے گا۔"

لالہ شاید جھانسے میں آگئے۔

مگر بھیا ـــــ تم نے تو جلیل کو یہیں بٹھا رکھا ہے۔ جلدی شہر بھیجو اب اسے۔ ہماری بھی تو یہی دعا ہے کہ وہ جلدی سے کوئی بڑا افسر بن جائے۔ خانصاحب ـــــ تم پیسوں کی فکر نہ کرو ـــــ اجی بیاہ ہم کریں گے ـــــ جیسا تمہارا بیٹا ویسا ہی ہمارا ہماری گودیوں میں بھی تو کھیلا ہے وہ ـــــ بہو کے نیک قدم سے کوئی نہ کوئی بڑا افسر بن ہی جائے گا۔ اور "

- - - - - - -

اور لالہ اب اپنے مستقبل کو میرے مستقبل کی جھوٹی روشنی میں دیکھنے لگے۔ لالہ کے چلے جانے کے بعد میں نے ابا سے صاف کہہ دیا کہ میں ابھی شادی نہیں کروں گا ـــــ جب تک میں کمانے کھانے اور خاندان کو پالنے کے ذرایع پیدا نہ کر لوں میں شادی نہیں کروں گا۔ میں سب کچھ جانتا ہوں۔ میری تعلیم کا بوڑھے باپ کے کندھوں پر رکھا ہوا پانچسو روپوں کی تھیلی کا یہہ بوجھ! میں جانتے بوجھتے اور دوسو روپوں کی تھیلی اس کی نحیف گردن پر لاد دوں ـــــ! یہہ سب جھوٹ ہے کہ میں کوئی بڑا افسر بننے والا ہوں مگر ہندوستانیوں کو

خدا کی قدرت پر اٹل اعتقاد ہوتا ہے۔ کوئی ہمایوں اپنے بیٹے کو اکبر اعظم کے مقدر سے کم نہیں سمجھتا۔ اور یہ سب کچھ نمرود کی آگ کو گلزار بنا دینے والے ان کرشموں پر اعتقاد کی نشانی ہے جو ادھر انیسویں صدی کے آغاز سے بالکل بند ہوگئے ہیں۔

میں انکار کرتا گیا اور فاطمہ کے مرجھائے ہوئے پھیکے پیلے چہرے کو دیکھ کر میں نے اپنے ابا کو ایک بار جھڑک بھی دیا۔ مگر حمیدہ بانو ـــــ میری بستر مرگ پر پڑی ہوئی ماں رونے لگی ـــــ اس وقت اس کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو بحیرۂ عرب کے موتیوں سے زیادہ تابناک تھے میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ میں کچھ بھی نہ دیکھ سکا، عقل نے سمجھ اور ادراک کی گھاٹیوں سے نکل کر یک لخت "ہاں" کر دی ـــــ ہندوستانی عورت اپنے آنسوؤں سے کیا کام لیتی ہے۔ اس ملک کی بدنصیبی میں اس کی عورت کے آنسوؤں کا بھی بہت بڑا دخل ہے۔

میری ماں نے اپنی موت سے چند گھنٹے قبل شہنائیوں کے شور میں میرے ماتھے پر رنگ برنگے پھولوں کا سہرا بھی دیکھا اور فاطمہ کی مانگ میں چنی ہوئی افشاں بھی دیکھی۔ اس کے ہونٹ مسکرائے ـــــ آنکھیں مسکرائیں جھریاں مسکرائیں اور مسکراتے مسکراتے اس کی بشاش مطمئن روح آسمان پر پھیلے ہوئے کالے کالے بادلوں میں جاتے کہاں روپوش ہوگئی۔

اندھیرے کا کرایہ

شادی کے تیسرے ہی مہینے فاطمہ کے ہونٹ پھیکے پڑ گئے۔ جسم میں وہ آتش نہ رہی۔ نظروں میں وہ کشش نہ رہی۔ زلفوں میں مہک نہ تھی۔ اعضا میں لچک نہ تھی۔ بیروزگاری میں تو عورت بھی مزا نہیں دیتی۔

ایک دن میں بڑا آفیسر بننے شہر چلا ہی گیا شہر پہنچنے کے پہلے ہی روز مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کسی قمار خانے میں چلا آیا ہوں۔ جو ہے مجھے لوٹ رہا ہے اور میں ہارتا جارہا ہوں۔ دفتروں، کچہریوں اور کوٹھیوں کا چکر کاٹتے کاٹتے جب دوپہر ہوگئی اور دھوپ کی حدت سے حلق میں پیاس کے کانٹے اُگنے لگے تو میں نے ایک چھوٹی سی ہوٹل کے چھوٹے منیجر سے پانی مانگا ــــ اس نے میرے گیبرڈین کے کوٹ اور پتلون کو جو یونیورسٹی کے زمانے کی یادگاریں تھیں۔ غور سے دیکھا۔ شاید اس نے سمجھا ہو کہ اس سوٹ سے ایک پیسہ تو نکل ہی آئیگا ــــ

صاحب ــــ یہاں سے میونسپلٹی کا نل بڑی دور ہے۔ ہم خود سقے کو فی مشک آٹھ آنے دیتے ہیں اس لیے فی گلاس ایک پیسہ چارج کرتے ہیں۔۔۔۔۔ لیکن آپ

لیمن کیوں نہیں پی لیتے۔ خالص برانڈن کمپنی کا صاب ـــــــ"
میں پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے آگے بڑھ گیا ــــ اور اپنے آپکو بنانے لگا۔

صاب آپ لیمن کیوں نہیں پی لیتے ــــ صاب آپ تو
بہت بڑے صاب ہیں۔ گیبرڈین کا سوٹ پہنے ہوئے ہیں
ــــ لیمن پی لیجئے ہم فی صاب فی لیمن فی آنہ چارج
کرتے ہیں ــــ

ایک چوراہا آگیا ــ اور میں نے اپنے آپ سے پوچھا ــ
اب کس راستہ چلیئے گا صاب ــــ؟

اس سوال پر مجھے زور سے ہنسی آگئی۔ اور بڑی شرمندگی ہوئی جب اسکول کی دو نوجوان لڑکیاں فٹ پاتھ پر سے جاتے ہوئے مجھے اپنے آپ ہنستا دیکھ کر بہت دور تک ہنستی چلی گئیں۔

شام کو ایک باغ کی روشوں پر ٹہلتا رہا۔ اور تھک کر ہریالی پر لیٹا، عورتوں، لڑکیوں، نرسوں اور آیاؤں کو گھورتا اور فاطمہ کو تصور ہی تصور میں دیکھتا ہوا گنگناتا رہا۔

جب بھی راہوں میں نظر آئے حریری ملبوس
سرد آہوں میں تجھے یاد کیا ہے میں نے

(ساحر لدھیانوی)

چاندنی رات تو نہیں تھی مگر شہروں میں چاند کی روشنی کی ضرورت ہی

کیا ہے۔ بجلی کے ایک ستے سے گولے کی جتنی قیمت ہے۔ چاند کی اتنی قیمت
کہاں —— بجلی کا گولا جاپانی ہی کیوں نہ ہو۔ کم ازکم دو روپوں میں
تو ملتا ہے —— اور چاند —— یہہ مفت کی روشنی بیچانے والا
—— اس کو کون دیکھتا ہو گا۔ شاید کوئی ناکام و نامراد عاشق بھی
اسی کی طرف نہیں دیکھتا ہو گا۔ یہی سوچتا ہوا میں اپنی سرائے کی طرف
جانے لگا جہاں میرا بستر اور ٹرنک رکھا ہوا تھا اسی سوچ بچار میں
راستہ ہی بھول گیا۔ ایک ہی طرح کی جگمگاتی سڑکیں، دوکانیں
—— جانے کونسا راستہ تھا۔ ایک بجے تک میں بھٹکتا ہی رہا
اور تھک کر سڑک کے کنارے ایک کھلے سائبان میں بیٹھ کر سگریٹ
پینے لگا۔ سگریٹ کے کڑوے کڑوے دھنوئیں سے حلق میں ایسا پھندا
پڑا کہ میں بے اختیار کھانسنے لگا —— کھانستے کھانستے جیسے
ابکائی آنے لگی۔ میری کھانسی کی آواز سن کر سائبان کے اندر کا دروازہ
کھلا اور ایک بوڑھا میری کھانسی کے سرعت اٹھاتا ہوا باہر نکلا ——
اور لالٹین کی روشنی میرے منہ پر ڈالتے ہوئے پوچھنے لگا ——

"کون ہو جی تم —— راتوں کی نیند اڑ گئی نہ جانے
کہاں کہاں کے لفنگے چلے آتے ہیں۔ ساری دنیا میں کیا
میری ہوی ایلی رہ گئی ہے۔ اپنی ماؤں بہنوں کو کیوں نہیں
چھیڑتے ——"

میں سمجھ گیا کہ اس بوڑھے کے سائے میں کوئی چنچل چھپی ہوئی ہے جس نے

میری طرح کے سب غنڈوں کو وارفتہ کر دیا ہے۔ میں نے بڑی لجاجت سے کہا۔

بابا ـــــ گھر کا راستہ بھول گیا ہوں۔ رات کی رات یہاں پڑ رہنے دو ـــ سویرے ہی چلا جاؤں گا ـــــ

وہ گرجنے لگا۔

واہ ـــ گھر کا راستہ بھی کوئی بھولتا ہے۔ تم چور معلوم ہوتے ہو ـــ تمہارا یہ سوٹ بوٹ ـــــ آجکل چور سوٹ بوٹ پہن کر ہی ڈاکے ڈالتے ہیں۔ بھاگ جاؤ نہیں تو سپاہی کو آواز دیتا ہوں "۔

چھن ـــــ چھن۔ چوڑیوں کی جھنکاریں کسی عورت کے وجود کا نغمہ اندر کوٹھری سے باہر آیا۔ میں اٹھ رہا تھا لیکن وہ کہنے لگی۔

ناتھ ـــــ رات کی رات پڑ رہنے دو۔ کیا ہرج ہے باہر پڑا رہے گا "۔

یہ مدھر آواز میں نے پہلے بھی کہیں سنی تھی۔ اس لیے ذرا جھک کر میں نے لالٹین کے اجالے میں اس کا چہرہ دیکھا ـــــ بیلا بالکل بیلا ـــــ بیلا کی آواز ـــــ بالکل بیلا کی آواز ـــــ وہ مجھے پہچان نہ سکی یا اگر پہچان بھی گئی ہو تو ـــــ نہیں نہیں۔ جب ناتھ سامنے کھڑا ہو تو کوئی بیاہتا عورت اپنے عاشق کو کیسے پہچان سکتی ہے ـــــ؟ ناتھ پھر بھی ناتھ ہوتا ہے۔ بوڑھا ہوا تو کیا ہوا ـــــ؟

بوڑھے نے اپنی آواز میں ذری سی نرمی پیدا کرتے ہوے کہا۔
دیکھو جی —— اگر رات گزارنی ہے تو آٹھ آنہ کرایہ
دو یہاں رہنے کا ——"

آٹھ آنہ کرایہ —— واہ! کیوں؟ ۔ یہاں تو اندھیرا بھی پکتا
ہے ۔ نہیں ۔ مجھے اتنا مہنگا اندھیرا نہیں چاہیے ۔ میں اس سے بھی سستا ۔
چار آنے اور دو آنے والا اندھیرا کیوں نہ خرید دوں —— !

یہہ کہتے ہوے میں نے سگریٹ کی ڈبیا سے دوسری سگریٹ نکال کر
جلائی تاکہ سگریٹ کے کشوں میں تھکی ہوئی ٹانگوں کی دکھن بھول جاؤں ۔
لالٹین کی روشنی میں بیلا کی آنکھوں میں نت نئے اشارے جھلکتے مچلتے صاف
نظر آرہے تھے —— یعنی مت جاؤ —— رات کی رات تم
رہ جاؤ ۔ مجھے اپنی پیاس بجھا لینے دو ۔ بہت دن ۔ سے میری رگوں میں
چیونٹیاں رینگ رہی ہیں ۔ میں دیدوں گی آٹھ آنے —— تم ٹھیر تو
جاؤ ۔ اور دیکھنا جذب محبت کا اثر آج کی رات ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

لیکن مجھے ان اندھیرے کی عورتوں سے بڑا ڈر لگتا ہے ۔ اسی لیے
میں سگریٹ کے لمبے لمبے کش کھینچتا ۔ سڑکوں پر پھیلے ہوئے بے قیمت
بے دام پھوکٹ مفت اندھیرے میں غائب ہو گیا ۔

رات ایک مسجد میں گزار دی ۔ آج مجھے مسجد کا صحیح مصرف معلوم ہوا ۔

چار درویش

دوسرے دن ایک نوکری کے انٹرویو کے لیے میں ایک دفتر جاکر ایک لمبی سی بنچ پر بیٹھا تھا۔ یکایک مسرت کے مارے اپنی جگہ سے ہل گیا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے ارد گرد نہ ہوا ہے نہ ہوائیں بلکہ مسرت ہی مسرت ہے، زندہ متحرک مادی لیکن سیال مسرت کا سمندر اور میں اس مسرت میں پھنس کر رہ گیا ہوں ـــــ میری نظروں کے سامنے میرے ہم نوایان یونیورسٹی۔ میرے پیارے دوست۔ مہندر، نوح اور ظفر کھڑے تھے۔ تینوں نے مجھے گلے لگا کر مسرت کے سمندر سے باہر نکالا۔ ہم نے ایک دوسرے سے پہلے پہل کچھ نہ پوچھا۔ بس ایک دوسرے کا منہ دیکھتے اور ہنستے ہنستے دوہرے ہوئے جاتے تھے۔ ایک اگر کچھ پوچھنا چاہتا تو دوسرے ہنس پڑتے ـــــ جیسے ایک عرصہ تک ایک دوسرے سے بچھڑے رہنے سے ہمارے چہرے بڑے مضحکہ خیز ہو گئے تھے۔

میں نے ان تینوں درویشوں کے ساتھ زندگی کی وہ بہاریں ایک ہی ہوسٹل اور ایک ہی کمرہ میں گزاری تھیں۔ ان سے قریب رہتے رہتے مجھے ان سے اتنی محبت ہو گئی تھی جتنی اپنے والدین سے بھی نہ رہی تھی۔ میں

اپنے والدین سے اتنے طویل عرصے تک نزدیک ہی کہاں رہا ـــــ محبت کی سب سی بڑی شرط تو قرب ہے۔ بلکہ قرب ہی محبت ہے۔

اسی شام نوح نے میرا بستر اور ٹرنگ مسجد سے اٹھوا کر منگوالیا۔ اب نوح کا گھر ہماری پناہ گاہ تھا۔ ظفر اور رہنمد بھی وہیں رہتے تھے۔ زندگی گزرنے لگی ـــــ بڑے مزے سے گزرنے لگی۔ ہم چاروں درویشوں میں یونیورسٹی کے زمانے سے ہی دوستی اور محبت تھی۔ ہم سب نے ایک ہی ساتھ بی۔اے کا امتحان پاس کیا تھا۔ ایک ہی ساتھ ڈگریاں لی تھیں اور پھر ایک ہی جگہ مل بیٹھے تھے۔

دن بھر کچہریوں، اسکولوں اور کوٹھیوں کے چکر کاٹتے اور شہر کی ناشاد راتوں میں سڑکوں پر آوارہ پھرتے ہوئے، راہ چلتی عورتوں کو تنقیدی نظروں سے دیکھتے سگرٹیں پیتے بالکل بھول گئے تھے کہ گردشِ شام و سحر جاری ہے۔

نوح کا منی آرڈر، پچاس روپے، مہینے کے مہینے آجایا کرتا تھا۔ اس کے آبا پنشن پائے ہوئے تعلقدار تھے اور پنشن کے زمانے کو آرام سے گزرنے کے لیے اپنی جاگیر میں رہتے تھے۔ اپنی وضعداری نباہنے کے لیے بیٹے کے لیے شہر میں ایک مکان لے رکھا تھا اور ایک خاندانی بوڑھا ملازم جس کو نوح دادا کہا کرتا تھا۔ ہم بھی اس کو دادا کہہ کر ہی پکارنے لگے تھے۔

نوح کے منی آرڈر میں کافی رزاقیت تھی۔ نوح بہت ہی نیک طینت انسان تھا مگر کبھی کبھی ہم تینوں میں سے کوئی ایک اپنے فطری کمینے پن کا ضرور اظہار کرتا۔

نوح ـــــ آنے دو وہ دن جب ہم سامراج کے نوکر
ہو جائیں گے۔ تمہارے اس احسان کا بدلہ تمہیں چاندی
اور سونے میں تول کر چکائیں گے۔"
نوح ہمارے اس کمینے پن کو محسوس کرتا مگر اس کو ایک مجبور انسان
کی اخلاقیات سمجھ کر مسکرا کر جواب دیتا ـــــ
بھئی میرا کیا احسان ـــــ خدا ہر شخص کو رزق دیتا ہے
تم اپنا اپنا رزق کھاتے ہو ـــــ اور کسی نے کہا ہے ـــــ
حساب دوستاں در دل ......
نوح کے اس جواب پر ظفر نہایت ہی بھدے خوشامدی انداز میں
اس کی پیشانی چوم لیتا۔ اس کی اس حرکت سے صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ
نوح کو ہر ممکن طریقہ پر خوش کرنا چاہتا ہے۔ خواہ نوح کو اس کی ضرورت
ہو یا نہ ہو۔ ہم تینوں کو ظفر کی یہ حرکت بڑی ناگوار گزرتی مگر یہ ظفر کی بڑی
پرانی کمزوری تھی۔ بلکہ موروثی کیونکہ ظفر خود کہا کرتا تھا کہ اس کے بعض
عزیز و اقارب آصف الدولہ کے دربار کے مشہور ظریف گزرے ہیں ـــــ
یہی وجہ تھی کہ ظفر جا و بیجا، وقت و بے وقت خود ہنستا ہمیں ہنساتا، خود خوش
رہتا اور ہمیں خوش رکھنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ مہندر کی ظفر سے اسی لئے
لڑائی ہو جاتی تھی۔ مہندر موقع اور محل کا بڑا لحاظ رکھتا تھا۔ اور ظفر کا
خیال تھا کہ موقع اور محل کی فکر انسان کو اتنا بزدل بنا دیتی ہے کہ وہ
موقع اور محل کے ہاتھ آجانے کے باوجود کچھ نہیں کر سکتا۔ مہندر در اصل

بہت جذباتی تھا۔ بڑی نازک تھی اس کی طبیعت۔ اسی لیے ظفر اس کو چھیڑتا ——

"یار —— اگر تمھاری شادی ہو جائے تو تمھاری بیوی
خود ناز کرنے کے بجائے تمھارے ناز اٹھاتے اٹھاتے بھاگ
نہ جائے کہیں ۔"

اس چھیڑ سے مہندر بھر اٹھتا اور سچ مچ ظفر کو گھونسوں، لاتوں اور مکوں سے کوٹنا شروع کر دیتا لیکن عادتاً غیر سنجیدہ ظفر تا لا پرواہ ظفر مکے اور گھونسے کھا کھا کر بھی زور زور کے ٹھٹے لگاتا۔ اور مہندر کا غصّہ اتنا بڑھ جاتا کہ اس کا حلیہ دیکھ کر میں اور نوح اپنی ہنسی روک ہی نہ سکتے تھے ——

کبھی کبھی میری یا نوح کی طبیعت افسردہ ہوتی تو ہم مہندر اور ظفر کو آپس میں لڑا دیتے اور اطمینان سے آصف الدولہ کی طرح گاؤ تکیوں سے لگ کر بیٹھتے اور ان دونوں اصیل مرغوں کا تماشہ دیکھا کرتے تھے۔ مہندر کہنے کو تو بڑا طاقتور تھا اور ظفر کو بری طرح پیٹا کرتا تھا مگر شکست مہندر ہی کو ہوتی تھی۔ کیونکہ ظفر ہمیشہ نان سیریس موڈ میں لڑا کرتا تھا اور مہندر اس کو مارتے پیٹتے تھک کر بڑبڑانے لگتا جیسے خود ہی ہار گیا ہو۔ بہر حال ظفر کا وجود ہماری بیروزگاری کے غم آگیں زمانے میں ایک پہرہ دار تھا جو غمِ روزگار کے بھوت کو ہماری روحوں میں گھسنے نہ دیتا تھا۔

زندگی گزر رہی تھی اور بڑے مزے سے گزر رہی تھی۔ رزق کی فکر سے آزاد —— غمِ روزگار سے دور۔ غمِ عشق سے پرے۔ صرف ایک ہی

مصیبت تھی یعنی سگرٹوں کا قحط بہت جلدی جلدی نازل ہوتا تھا مگر مجھے، نوح اور مہندر کو ریڈیو اسٹیشن یا کسی اخبار کے دفتر سے کبھی کبھی کچھ پیسے مل جاتے ان میں سے آدھے سے زیادہ پیسوں کی سگرٹیں خریدی جاتیں اور باقی پیسے ٹولی کے سب سے زیادہ دیانتدار درویش نوح کے حوالے کر دئے جاتے۔ جو خالص کمیونسٹ اصولوں کو روبہ کار لاتے ہوئے سب میں مساوی تقسیم کر دیتا تھا۔ ظفر کو اپنے نفس پر کوئی قابو نہیں تھا۔ اسی لیے دوسرے یا تیسرے ہی دن اپنی سب سگرٹیں پھونک کر ہم لوگوں سے ایک کش اور دو کش کی بھیک مانگا کرتا تھا ــــ اس کو بھیک دینے سے قبل نوح اس کو ضرور نصیحت کرتا۔ بڑے موذی کو مار نفس امارہ کو گر مارا ــــــ ظفر پوری بتیسی دکھا کر ہنسنے لگتا یعنی وہ نفس امارہ کو کسی حال میں بھی مارنا نہیں چاہتا، بلکہ اس کی خاص نگہداشت سے بچے کی طرح پرورش کرنا چاہتا ہے۔

اور پھر وہ یونیورسٹی کے پروفیسر دینیات کے خاص خطیبانہ انداز میں اپنی مٹھی بھینچے ہوئے ہاتھ کو ہوا میں بلند کرتے ہوئے گرجدار آواز میں پکار اٹھتا ــ

یارو ــــــــ اپنا مورل (MORAL) جتنا
خراب کر سکتے ہو کرو ــــ سوسائٹی سے انتقام لینے کا صرف
یہی ایک موثر طریقہ ہے"۔

میں اور نوح اپنے اس حقیقت گو اور صادق بیان مقرر کی حوصلہ افزائی

کے لیے تالیاں بجاتے اور ظفر اس کی شہ پاکر بڑے موثر انداز میں بولتا۔

ہاں جی اور کیا ـــــــ ہم انسان ہیں اور انسان
ہی رہنا چاہتے ہیں نفس امّارہ اگر مر گیا تو انسان مر گیا ـــ
برہمچاری بن کر جینا تو فضول ہے۔ ہی ہی ہی ـــــ
ہا ہا ہا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

برہمچاری کا لفظ سُن کر ہم پر ہنسی کے دورے پڑنے لگتے۔ اور مہندر اپنے حلیہ کو غضبناک ـــــ اور مضحکہ خیز بنا کر ہمیں ایسی فحش اور مغلظ گالیاں سناتا جو ہماری ہنسی کے شعلوں پر تیل کے چھینٹوں کی طرح گرتیں۔ برہمچاری دراصل مہندر کا اڑا نام تھا جو ظفر نے یونیورسٹی کے زمانے میں مہندر کی شخصیت اور اس کی جنسی زندگی کا بڑے مزاحیہ انداز میں خاکہ اڑاتے ہوئے ایک نامعقول اور فحش جملے کے ساتھ یہ کہہ کر دیا تھا کہ "ارے وہ برہمچاری ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس دن سے برہمچاری مہندر کی چڑ تھی۔ پہلے پہل مہندر بے جانے بوجھے اس ہنسی میں شریک ہوتا تھا لیکن جس دن اسے معلوم ہوا کہ وہ اس کا اپنا نام ہے تو اس نے بے انتہا ناراضگی سے ہمیں لاتعداد گالیاں سنائی تھیں ـــــ رو پڑا تھا، خودکشی کر لینے کی دھمکی بھی دی تھی اور ایک دن تو ہم اسے ریلوے لائین سے سمجھا منا کر لے آئے تھے کہ آیندہ سے کوئی اسے برہمچاری نہ کہے گا۔ اس کو سمجھایا گیا تھا کہ اس کو برہمچاری صرف اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ ایک پاکباز زندگی کا قائل ہے۔ ظفر نے

بھی ہاتھ جوڑتے ہوئے معافی چاہ کر قسم کھائی تھی کہ اس کا مقصد اس کی جنسی زندگی پر حملہ کرنا نہیں تھا خصوصاً جبکہ مہندر کا خیال جنسی فسانے لکھنے سے قبل ہندوستان کو جنسی تعلیم دینا تھا، اور وہ جنسیات پر ایک مدلل انسائیکلوپیڈیا لکھنا چاہتا تھا۔

اس طرح ہم چاروں درویش ہنستے بولتے گالیاں بکتے سگریٹیں پیتے بھول گئے تھے کہ دن غروب ہو رہے ہیں اور راتیں طلوع ہو رہی ہیں راتیں غروب ہو رہی ہیں اور دن طلوع ہو رہے ہیں ۔ اس طلوع و غروب کا احساس ہمیں صرف اسی وقت ہوتا جب کبھی نوح کا منی آرڈر دیر سے آتا ــــ اور پھر کسی نے طلوع و غروب ماضی، حال یا مستقبل کا ذکر کیا ۔ تو سزا کے طور پر اس کے جیب خرچ میں بالاتفاق آرا خاص کمی کر دی جاتی ۔

ایک دن مہندر نے بھول کر کہہ دیا ۔

"یار کل سے تو اپنے ٹھاٹھ ہیں ۔"

ظفر نے اپنی جگہ سے اچھل کر کہا ۔

"اس نے کل کا نام لیا ہے ۔ اس کو سزا ملنی چاہیے ۔"

مہندر نے اسی طرح مسکراتے ہوئے کہا ۔

"مگر بات تو سنو ۔ آج مجھے ایک نوجوان لڑکی کو اردو پڑھانے کی ٹیوشن ملی ہے ۔"

ٹیوشن ملی ہے ــــ ! ہم سب ایک زبان ہو کر پوچھ اٹھے ۔

ظفر نے ناچتے ہوئے کہا۔

مہندر کی سزا معاف ہونی چاہیے ـــــ مہندر ـــــ

لیکن ایک بات تو بتاؤ کہ اس کی عمر کیا ہے ۔ ؟"

مہندر ابھی تک ٹیوشن کی تفصیلات بیان کر رہا تھا اس لیے چڑ کر کہا۔

"ہم کوئی تم جیسے اٹھاؤ چولھے تو ہیں نہیں کہ آج نوکری کی کل سامراج کو گالیاں دیتے گھر بیٹھ گئے۔ ارے ہماری ٹیوشن کی عمر تو بہت لمبی ہے "۔

ظفر نے مہندر کی طرف دیکھ کر ہم دونوں کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ بھئی اب تم ہی انصاف کرو کہ یہ واقعی برہمچاری ہے کہ نہیں ـــــ پھر اس نے اپنی گردن مہندر کی طرف لمبی کرتے ہوئے دانت پیس کر جواب دیا۔

" ابے عقل کے پتلے! اشکار پور کے بادشاہ! میں ٹیوشن کی عمر نہیں پوچھ رہا ہوں "۔

مہندر نے کھسیانے ہو کر مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

" اوہ ـــــ تم اس کی عمر پوچھ رہے ہو! اس کی۔ ؟

ظفر نے پہلی بار متانت سے جواب دیا۔

" جی ہاں ـــــ اس کی عمر "

مہندر اپنے جملوں سے فضا میں اس لڑکی کا مجسمہ بناتا گیا اور اس کے ایک ایک جملے پر ہم صدائے بازگشت دینے لگے۔

"اس کی عمر اٹھارہ سال ہے ——
"اٹھارہ سال !
"اس کا رنگ شفق کی طرح سُرخ ہے۔"
"شفق کی طرح سُرخ !"
"وینس کے مجسمے کی طرح لمبی ہے۔"
وینس کے مجسمے کی طرح لمبی !"
اس کی زُلفیں سونے کے تاروں کی طرح چمکیلی اور سنہری ہیں۔
"سُنہری اور چمکیلی !"

مگر بہت ہی جلد ہم سب کی صدائے بازگشت دھیمی پڑ گئی اور رفتہ رفتہ ہم سب خاموش ہو کر اپنے آپ میں کھو گئے۔ مہندر نے یہ بہت بُرا کیا کہ قہقہوں اور سگریٹ کے دھوئیں میں اخبار کے ضرورت والے۔ کالموں میں بھُولی ہوئی اس حسرت کی یاد دلا دی جسے عورت کہتے ہیں۔ عورت —— ! عورت جس کے لیے ہم رات کے پچھلے پہر تک گھوما کرتے تھے۔ اور جب تھک کر اپنے بستروں پر لیٹ جاتے تو وہ ساری عورتیں جنھیں ہم دن کے اجالے میں اور رات کی روشنیوں میں دیکھا کرتے تھے خوابوں میں ناچ ناچ کر ہمیں تنگ کرتی تھیں۔ ہم انھیں بھول جاتے تھے بلکہ ہم تقریباً بھول ہی گئے تھے۔ ہم انھیں دیکھتے ضرور تھے مگر ایسے ہی بے مطلب بے خواہش اور بے مقصد جیسے وینس کے مجسمے کو دیکھا کرتے تھے۔ اور دو ایک تعریفی جملے کہہ کر اپنی ٹھنڈی اُداس

آہوں کو اپنی روح کی خلا میں دباتے گزر جاتے تھے۔ ہماری راتوں کی آوارہ گردی میں ظفر اکثر کہہ اٹھتا تھا۔

"یار ـــــ کوئی عورت ہمیں اکیلی مل جائے"۔

ہم سب یہہ چاہتے تھے کہ کوئی عورت ہمیں اکیلی مل جائے۔ اس پر کبھی ہم نے نہیں سوچا تھا کہ کوئی عورت اگر اکیلی ملجائے تو ہم کیا کرنے والے ہیں۔ البتہ ہم اس کے ساتھ ضرور کوئی ایسا سلوک کرتے جس کو اگر انتقام بھی کہا جائے تو غلط نہ ہو۔ کیونکہ عورت ہی تو ایک ایسی مخلوق ہے۔ جو ہم سے زیادہ کمزور بے بس اور بے اختیار ہے۔ اور ہم صرف اسی سے انتقام لے سکتے ہیں۔

اب جہندر نے اٹھارہویں سال اور سنہرے بان کی سوئی ہوئی یاد کو جگا کر جنسی فتنے کو بھی جگا دیا تھا۔ اس کے تذکرے کے بعد سے ہر شخص اپنے آپ میں کھو گیا۔ میرے ذہن اور تصور پر تو جیسے فاطمہ کی زلفوں کا چمکیلا اندھیرا پھیل گیا اور ان زلفوں کی خوشبو نے میرا تنفس اتنا تیز کر دیا کہ میں محسوس کر رہا تھا۔ جیسے میں کہیں سے بھاگتا ہوا آیا ہوں میری نظریں دیکھ رہی تھیں کہ فاطمہ برسات کی شاموں، جاڑے کی راتوں، گرمی کی چاندنیوں میں رات رات بھر اپنے جسم کی حدت سے تڑپ تڑپ کر کروٹ پر کروٹ بدل رہی ہے۔

شام تک ہم سب پر جمود اور سنجید گی طاری رہی۔ اور سر شام ظفر نے ہمارے اس جمود کو توڑا۔

" آج ساری رات گھوما جائے "

نوح نے منعیانہ انداز میں سر ہلاتے جواب دیا۔

نہیں —— آج رات ہماری شب گردی موقوف

ہے۔ کیونکہ میری جیب سے کسی نے سکشول فنڈ ——

—— چرالی ہے۔

ظفر نے دیدہ دلیری سے جواب دیا۔

میں نے چرائی ہے۔ مگر خرچ نہیں کی ہے۔ آج ہم کسی حالت

میں بھی شب گردی موقوف نہیں کر سکتے ——

سکشول فنڈ کا قصہ یہہ تھا کہ کم از کم ایک چونی نوح کی جیب میں ہمیشہ محفوظ رہتی تاکہ ہماری طرح کی کوئی زندگی سے بھٹکی ہوئی عورت جو آج تک ہمیں نہیں ملی۔ بالفرض اگر مل جائے تو یہہ سمجھنا چاہیے کہ اس کو کم از کم ایک چونی کی ضرورت ہے۔ جس کو مسخرے ظفر نے جمال متانت سکشول فنڈ کا نام دے رکھا تھا۔ یہہ فنڈ انفرادی ضروریات سے زیادہ اجتماعی ضروریات کے لیے کھولا گیا تھا اسی لیے اجتماعی حقوق کی حفاظت کے لیے ہم نے ظفر کے لیے اس کی چوری کی پاداش میں یہہ سزا تجویز کی کہ آج رات وہ ہم تینوں کے بستر لگائے۔ اور اب وقت گزارنے کے لیے ہمارے سروں کی چمپی کرے۔ ظفر کے پاس قانون اور سزا کی کوئی اہمیت ہی نہ تھی وہ دن بدن کچھ کچھ انارکسٹ ہوتا جا رہا تھا۔ اسی لیے خاص مزاحیہ انداز میں اس نے جواب دیا۔

قانون ایک غریب کنواری لڑکی ہے۔ جو اس لیے پیدا ہوئی کہ اس سے کھیلا جائے اور جب کھیلتے کھیلتے طبیعت سیر ہو جائے تو اسکو ایسا چھوڑا جائے کہ وہ ویس کے مجسمے کی طرح ساکت ہو جائے۔

شام کے وقت ہم حیدر کو اس کی شاگرد کے گھر چھوڑنے گئے اور اس راستے سے گئے جس پر ایک عالیشان جرمن طرز کا مکان ہے اور جس کی کھڑکیوں میں سے چار نوجوان لڑکیاں ہمیشہ جھانکتی رہتی ہیں۔ ہم جب کسی نیک کام کے لیے نکلتے تو پہلے ان چاروں میں سے کسی کی صورت دیکھ لینے کو بڑا اچھا شگون سمجھتے تھے۔ یہ چاروں لڑکیاں ہم چاروں درویشوں کو ہمیشہ ساتھ دیکھ کر پر اسرار ہستیاں سمجھ کر کھڑکیوں میں سے جھانک کر مسکراتی ہیں اور ان کی مسکراہٹیں ہمارے کاموں میں ہمیشہ کامیابیاں بن کر داخل ہوتی ہیں۔ ہم چاروں نے اپنے لیے ایک ایک لڑکی ان میں سے چن لی تھی، اور اپنے اپنے دل اور اپنی اپنی آنکھوں اور تخیل میں آباد کر لی تھی۔ ظفر چاہتا تھا کہ وہ ان کی مسکراہٹ کو اور بھی قریب سے دیکھے تاکہ ان کی مسکراہٹ کا کوئی واضح مفہوم سمجھ میں آجائے۔ ورنہ یہ دور کی مسکراہٹ تو فلموں میں اور افسانوں میں بھی نظر آتی ہے۔ لیکن پھاٹک پر دو گرانڈیل پٹھان پہرداروں کو دیکھ کر گرگ باراں دیدہ نوح منتبہ کرتا ——

یار —— ان اونچی کھڑکیوں میں سے جھانکنے والیوں کی مسکراہٹ صرف دیکھنے ہی کی ہوتی ہے۔ انھیں چکھنے کی

کوشش ہی نہ کرو۔"

ظفر اس مضمحل خیال پر گرج کر جواب دیتا ——

آنے دو وہ دن —— ابھی میں تو ان مسکراہٹوں کو اپنے ہونٹوں میں بھر لوں گا ——"

وہ کونسا دن آنیوالا تھا —— ؟ کب آنے والا تھا —— ؟ یہہ ہمیں نہیں معلوم البتہ ہم سب کو اس دن کے طلوع کا بے حد انتظار تھا ۔

بیسوا مرد

مہندر کو ٹیوشن کیا ملی وہ اپنے آپ کو ہم تینوں سے کچھ اونچا، کچھ معزز سمجھنے لگا۔ مگر تعجب کی بات یہہ تھی کہ مہندر کو روز پانچ سات روپے کہاں سے مل جاتے ہیں"۔ ٹیوشن تو مہینے کے مہینے ملتی ہے!۔ ظفر نے ایکدن مہندر کی غیر حاضری میں کہہ دیا ــــــ

ٹیوشن ویوشن سب غلط ــــ مجھے کچھ شبہ ہوتا ہے کہ کہیں اس نے گرہ کاٹنے کا پیشہ نہ اختیار کر لیا ہو ــــــــ کل میں نے اس کی جیب میں رجس کی ایک قینچی بھی دیکھی ہے"۔ نوح نے کہا ــــ

ایسے سفید جھوٹ نہ بولو۔ وہ تو مونچھیں کترنے کی قینچی ہے۔ اس سے گرہ کیا کٹ سکتی ہے۔ مگر مجھے بھی اس میں کوئی راز ہی معلوم ہوتا ہے"۔

مجھے ہنسی آ گئی۔

یار ــــــ تم لوگ بھی اس پر ایسے ہی شبہ کر رہے ہو جیسے وہ کنواری لڑکی ہے ــــ ارے مرد ہے۔ کہیں نہ کہیں

کما لیتا ہو گا ـــــ ہاں یہہ بہت بُری بات ہے کہ وہ اس کا
علم ہمیں نہیں ہونے دیتا ـــــ

ظفر بولا ـــــ نہیں جی ـــــ دن بدن وہ بگڑتا جا رہا ہے۔
ـــــ ہمارے لاڈ پیار سے ـــــ"

پھر ہم سب نے مل کر طے کیا کہ آج شام چوری سے مہندر کا تعاقب
کیا جائے اور جب اس شام مہندر غسل خانے میں نہاتے ہوئے لہک لہک کر
گا تا رہا ـــــ

"رات سہریا یہ بھول گئی کنگنا"

تو ہم سب کا شبہ پختہ ہو گیا ـــــ مہندر نے غسل کے بعد نوح کا ایک بہترین
ٹویڈ کا سوٹ پہنا جو نوح کے ابا نے نوکریوں کے انٹرویو کے لیے اپنی
وضعداری کو نباہنے کے لیے سلا دیا تھا۔ بڑی دیر تک مانگ سنوارتا رہا۔ اور
دروازے سے باہر نکلتے ہوئے انتہائی شوخی سے ظفر کے سر پر ایک چپت
بھی لگائی جس کے جواب میں ظفر نے ایک نہایت گندہ گالی دی۔ مگر
مہندر اپنی انگلیوں سے ایک بوسہ چوم کر ظفر کی طرف پھینکتے ہوئے گنگنایا
ارے بھول گئی کنگن ـــــ ہاں آں ـــــ
رات سہریا یہ ـــــ ارے رات۔۔۔۔"
اور مسکراتا گنگناتا باہر چلا گیا۔

ہم تینوں نے بھی اپنی اپنی شیروانیاں پہنیں اور مہندر کا ایسے ہی
تعاقب کرنے لگے جیسے مہندر کی چوری پکڑ لینے سے ہمیں کوئی بڑا گراں قدر

انعام ملنے والا ہے۔ سڑکوں پر کی روشنی جلنے تک مہندر کنگسوے روڈ پر ادھر اُدھر مارا مارا پھرتا رہا۔ اور پھر جب ایک گھڑی ساز کی دکان کی چھوٹی بڑی گھڑیوں نے آٹھ بجائے تو وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا راک ڈیل ریستوران کی سڑک پر چلنے لگا۔ اور راک ڈیل کے جگمگاتے پھاٹک پر کھڑے ہوکر سگریٹ سلگائی ۔۔۔ ہم تینوں سینٹ جارجز گرلز اسکول کے پاس لیٹر بکس پر جھکے ہوئے برگد کی گہری اندھیری چھاؤں میں چھپے کھڑے تھے۔ ابھی پانچ منٹ بھی نہ گزرے ہوں گے کہ ایک چھوٹی سی خوبصورت کار ۔۔۔ پننگ پننگ کرتی ہوئی مہندر کے قریب ایک لمحے کے لیے رکی اور تیزی سے راک ڈیل کے احاطے میں داخل ہوگئی۔ مہندر جھوم کر اس کے پیچھے چلا گیا۔

ڈیڑھ گھنٹے تک ہم وہیں ٹھہرے رہے ۔۔۔ پھر پننگ ۔۔۔ پننگ کی آواز کے ساتھ کار پھاٹک پر ہلکی سی جمپ لیتی ہوئی باہر نکلی اور سیمنٹ روڈ پر سنسناتی ہوئی نکل گئی۔ مہندر کار کے پیچھے ہی سگریٹ پیتا باہر نکلا۔ اس کے کوٹ کے کالر اٹھے ہوئے تھے اور قدم تھکے تھکے ۔۔۔ پھاٹک کے سہارے کھڑے ہوکر وہ کنگسوے کی روشنیوں میں مدغم ہوتی ہوئی موٹر کی سرخ قندیل کو وہ بڑی دیر تک دیکھتا رہا اور پھر ایک گہرے کش کا غلیظ دھنواں سڑک کے کنارے جب چاپ جلتے ہوئے بجلی کے کوے کی طرف پھینکتا وہ گرلز اسکول کے پیچھے والی سڑک میں غائب ہوگیا۔

ظفر سے نہ رہا گیا۔ اس نے کچھ سخت لہجے میں کہا —— "میں نہ کہتا تھا کہ یہ ہوشن تولیشن ریسٹورنٹ ہے۔ نوح نے کسی خاص مصلحت سے اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا ——

خفا نہ ہو میرے دوست —— آؤ
ذرا ہم بھی راک ڈیل چلیں"۔

راک ڈیل کی رستوران کی ولایتی شرابوں، قیمتی سگرٹوں اور انگریز عورتوں کی خوشبو سے معمور فضائیں چائے پینے سے پہلے ہی مجھے ہلکا ہلکا سرور آنے لگا —— مگر ظفر ابھی تک غضبناک تھا۔ اس کی ہر بات ہمیشہ جلد بازی پر ختم ہوتی تھی۔ چنانچہ جب بوائے ہماری میز پر چائے کا سامان جما رہا تھا تو اس نے پوچھ ہی لیا ——

"کیوں جی —— ابھی ابھی جو موٹر آئی تھی اس میں
کون آتا ہے یہاں ——؟"

بوائے ظفر کی طرف پوری بتیسی دکھاتے ہوئے مسکرانے لگا ——

"دانت مت دکھاؤ —— بتاؤ ہم تمھیں اس کے بدلے
انعام دیں گے"۔

انعام کی خبر سن کر بوائے کے جسم میں جیسے میر جعفر کی روح آگئی، اور اس نے خوش ہو کر کہنا شروع کیا۔

"بن پریوں کی پری ہے صاحب وہ —— وہ جس پر مہربان
ہو جائے تو بس اس کے بھاگ کھل جائیں"۔

پھر وہ سرگوشی میں کہنے لگا ـــــــ

"صاب ــــــ اس کو تو آپ جیسے جوان لڑکے چاہئیں ورنہ پہلے تو روز ایک نیا لاتی تھی مگر ادھر کچھ دن سے ایک ہی لڑکا ــــــ شاید کالج کا جان پڑتا ہے۔ روز وہی آتا ہے اور میم صاحب دس بیس روز خرچ کو دے جاتی ہیں۔"

ظفر نے بوائے سے ایک عجیب مہمل سوال کیا۔

"اس کا شوہر نہیں ہے کیا ــــــ؟"

بوائے نے ظفر کا نیچے گرا ہوا رومال میز پر رکھتے ہوئے کہا

ارے صاب ــــــ سنتے ہیں کہ وہ کپتان ہو کر دو سال سے لڑائی پر گیا ہے ــــــ

ہم تینوں ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے۔ بوائے نے سر کھجاتے ہوئے کہا ــــ

"میرا انعام صاب ......"

ظفر نے جیب سے ایک چونی نکال کر اسے دیدی۔ بوائے نے کھٹ سے ایک سلام کیا اور اس کے چلے جانے پر ظفر بھی بغیر چائے پیے وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔

رات ظفر اور مہندر کی لڑائی ہو گئی۔ دونوں ایک دوسرے سے چڑے ہوئے تھے۔ ظفر کہتا تھا کہ تم چاہے کسی کی جیب کاٹو مگر اس طرح کی آمدنی سے مردانگی پر کلنک کا ٹیکہ نہ لگاؤ۔ مہندر کا استدلال تھا کہ

میں صرف زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ مردانگی اور غیر مردانگی کچھ نہیں جانتا ——— مجھے چاہے مہندر سمجھ کر گلے سے لگا لو۔ چاہے سیل پر ڈسٹیلوٹ کہہ کر دھتکار دو ——— مجھے منظور ہے۔ مگر میاں ظفر میری قیافہ شناسی کی داد دو کہ اب تم سب کے دلوں میں یہی آرزو مچل رہی ہے کہ کاش ہم مہندر کی جگہ ہوتے۔

"دھت ——— ظفر نے دھتکار دیا۔

"ہم میں اب بھی مردوں کی غیرت ہے۔ ہم ہندوستانی مرد ہیں مفلس مگر عزت دار۔ ایک ہندوستانی مرد بھوکا اور ننگا ہو کر بھی چار چار عورتوں کو پالنے کی ہمت رکھتا ہے۔ لیکن تم کو ایک عورت پال رہی ہے ——— تم ہمارے دیس کی اس تاریخی روائت پر الزام نہ لگاؤ۔

مہندر نے ظفر کی پیشانی کو گھورتے ہوئے جیسے اس کا قیافہ پڑھ رہا ہو، کہا ———

دیکھنا ظفر ——— اپنی باتوں کو بھول نہ جانا۔ کل ہی شام میں اس سے تمھارا تعارف کراؤں گا اور تم ——— میرے گفتار کے غازی ——— تم ہار جاؤ گے۔ تم مجھ سے اپنی اس بکواس پر معافی چاہو گے۔ مگر میں تمھیں کبھی معاف نہ کروں گا ———"

یہہ کہتے ہوئے مہندر نے ہم دونوں کی طرف دیکھا اس کی نظروں میں اپنی سچائی کا کچھ ایسا یقین تھا کہ ہماری نگاہیں چار نہ ہو سکیں۔ آنکھیں خود بخود

جھپک گئیں۔ یا تو ہم مہندر کی چوریاں پکڑنے گئے تھے یا یہ ہوا کہ مہندر
ہمارے ہی ناپاک ارادوں کے نقاب بیرحمی سے الٹتا جا رہا تھا۔

وہ رات خلاف توقع چپ چاپ کٹ گئی۔ کسی نے رات کے سلام
اور آخری قہقہے کو یاد نہیں کیا۔ آج فیض کی وہ نظم

پھر کوئی آیا دل زار! نہیں کوئی نہیں
راہرو ہوگا کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سو گئی راستہ تک تک کے ہر ایک راہگذر
اجنبی خاک نے دھندلا دئیے قدموں کے سراغ
گل کرو شمعیں، بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا

بھی نہیں پڑھی گئی جو ہم میں سے کوئی ایک سونے سے پہلے ضرور پڑھ لیتا تھا۔
صبح جب آنکھ کھلی تو مہندر کا بستر نہ دکھائی دیا۔ نوح بستر پر لیٹے
لیٹے آنکھیں کھولے دیوار پر بیٹھے ہوئے ایک کوے کو دیکھ رہا تھا — ظفر
رضائی اوڑھے اکڑوں بیٹھے ہوئے کہہ رہا تھا —

وہ ایک عورت کے لیے ہمیں چھوڑ گیا — چاندی کے
چند ٹکڑوں کے عوض برسوں کی دوستی اور محبت قربان کر دی۔

جیا اے مہندر میں تجھے بد دعا دیتا ہوں کہ زندگی بھر تو ایک
ہلکی سی مسکراہٹ کے لیے بھی ترستا رہے گا"

ظفر کہنے کو تو بڑا غضبناک ہو رہا تھا مگر بڑا دکھی معلوم ہو رہا تھا۔ یوں تو وہ مہندر کو بددعا دے رہا تھا مگر ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اس کی بد دعا صرف زبان سے ہی تھی۔ دل کو اس سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اور اس نے مہندر کو بڑی حد تک معاف کر دیا تھا کیونکہ مہندر اگر یہہ پیشہ بھی نہ کرے تو پھر کیا کرے۔ کوئی نوکری بھی تو نہیں دیتا۔ زندگی اتنی دشوار گزار ہے کہ پیسے کے بغیر ایک قدم بھی تو آگے نہیں اٹھتا۔ اور وہ عورت بھی بے قصور ہے — اس کا شوہر لڑائی پر گیا ہوا ہے۔ ہندوستان خطِ استوا سے بہت قریب ہے۔ سردی کی راتوں میں بھی جسم اتنا پھنکنا رہتا ہے کہ لحاف اوڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ وہ مجبور ہے۔ بے قصور ہے۔ اس کو بھی زندگی پیاری ہے۔ زندگی سبھی کو پیاری ہے۔ زندگی ہی انسان کی ازلی اور ابدی معشوقہ ہے۔ اور یہہ زندگی صرف چار ہی دن کی تو ہوتی ہے۔ چار ہی دن تو فرصتِ لطف ملتی ہے۔ پھر جانے آنکھ بند ہونے کے بعد کیا ہونے والا ہے — ؟

مہندر کے چلے جانے کا ہم تینوں کو بڑا قلق تھا۔ کئی دن تک ہم نے قہقہہ تو کجا کبھی ہلکی سی مسکراہٹ بھی ایک دوسرے کے ہونٹوں پر نہیں دیکھی

ردّی

ایک طویل عرصہ بعد نوح کے پراسرار سنسان گھر میں ایک دن ایک بڑا بلند آہنگ قہقہہ گونجا۔

ہم تینوں درویشوں نے صبح سے کچھ بھی نہیں کھایا تھا۔ نوح کے منی آرڈر کا آخری پیسہ بھی ختم ہو چکا تھا البتہ سگرٹیں بہت سی بچ رہی تھیں۔ ہم صرف سگرٹیں پی رہے تھے اور ایسے پی رہے تھے جیسے دھوئیں کے ذریعے بھوک مٹانے کا کوئی نیا انوکھا تجربہ کر کے دیکھ رہے ہوں۔ نوح نے کہا۔

یار اگر دھوئیں کے ذریعے بھوک رفع ہو جائے تو ہم سارے دیس کو بھوک کی لعنت سے نجات دے سکیں گے۔"

ظفر نے جواب دیا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ تمہارا پیٹ اس وقت بھی بھرا ہوا ہے جس کی وجہ سے تمہارا دماغ ابھی تک تمہارا ساتھ دے رہا ہے۔ مگر ہم سے تو ایسے فلسفے اس وقت نہ بگھارو۔ ہمارے سوچنے اور سمجھنے کی قوت جواب دے چکی ہے۔"

میں نے بھی کہا ــــــ

ہاں بھئی ـــــ آسان اردو میں بات کرو اس وقت"۔
نوح جھینپ گیا۔ مگر پھر فلسفہ بگھارنے لگا۔
میں یہہ کہہ رہا تھا کہ دھوئیں کے ذریعے سے بھوک دفع
کرنے کا ہمارا یہہ تجربہ کامیاب ہوجائے تو ہم اپنی اس ایجاد
کو بغیر کنجوسی اور بخالت کے سارے دیس کو بتا دینگے ـــــ"
ظفر نے نوح کی بات کاٹی۔
نہیں ـــــ تم اپنی پرانی گنجلک زبان سے باز نہ آؤگے۔
میں سمجھ گیا کہ تم کیا کہنے والے تھے اور شاید جلیل بھی سمجھ گیا ہے
مگر تمھارے مافی الضمیر کو اب میں بیان کروں گا اگرچہ کہ
اب اس کی ضرورت نہیں رہی جب کہ ہم سب سمجھ گئے ہیں۔ مگر
چونکہ میں پرانے پن کا دشمن ہوں اس لئے تمھاری گنجلک
ادق اور فلسفے لپٹی ہوئی زبان کے خلاف جہاد کروں گا"۔
میں ہنس پڑا اور کہنے لگا ـــــ
ظفر ـــــ کیا تم اپنی باتیں اپنے کانوں سے سن رہے ہو۔
تم جہاد کرنے چلے تھے مگر میر جعفر بنتے جارہے ہو۔ ٹھیرو میں جہاد
کروں گا۔ میں تم دونوں کے مافی الضمیر کو سمجھاؤں گا ـــــ
آسان، سہل اور سلیس زبان میں ـــــ اگر ہم دھوئیں
سے بھوک بجھانے کا یہہ سہل نسخہ بتادیں گے تو میرو اسپرنگل لاج
میں جان بَل رہیں یا سوُرج دیوتا کے سپوت ـــــ ہمارے

دیس کے آنسو تھم جائیں گے۔ اس کی چھینی ہوئی مسکراہٹ
اس کے ہونٹوں پر ایک دوامی رقص کرے گی ـــــ
ظفر یوں ہی چیخ پڑا
بس کرو ـــــ ہم میں سے کوئی بھی مجاہد نہیں ہم یا تو
فلسفی ہیں یا پھر شاعر ـــــ ایسی ہی لمبی لمبی باتیں
کرتے رہیں گے اور بھوک کبھی نہ بجھے گی۔"

نوح نے منمنی سی آواز میں "ہیر ہیر" کہہ کر تالی بجائی لیکن میں گھبرا گیا کہ ظفر اس حوصلہ افزائی سے بہک کر اب بہت بولنا شروع کردے گا۔ بھلا جس نے کبھی اتفاق سے بلکہ عام الفاظ میں خوش قسمتی سے کسی بڑے لیڈر قوم کی تقریریں جمائیاں لیتے، ٹو آئس پر بیٹھی ہوئی لڑکیوں اور عورتوں کے کارٹون بناتے سنی ہو، وہ ظفر جیسے مقرر کی چرب زبانی کی کیا تاب لاسکتا ہے ـــ؟ اسی لیے میں نے ظفر کی زبان کو روکنے کے لیے ایک ترکیب سوچ لی اور جلدی سے کہہ دیا۔

یار ـــــ دیکھو ایک ترکیب میرے ذہن میں آئی ہے
نوح نے نوکریوں کے لیے انٹرویو کے لیے اخباروں کے
تراشے جمع کر رکھے ہیں۔ انھیں ردّی میں بیچ آؤ۔"
نوح نے گھبرا کر کہا۔
کیا بکتے ہو۔ میں ایک پرزہ نہ دوں گا ـــ ان تراشوں
میں اطلانتک چارٹر ہے۔ معاہدہ ورسائی ہے۔ پاکستان

اسکیم ہے ۔ کرپس آفر ہے ۔ کانگریس کے تمام صدارتی خطبے ہیں ۔ چرچل کی تقریریں ہیں ۔ گاندھی کا فلسفہ عدم تشدد ہے ——— ارے سبھی کچھ تو ہے ۔

ظفر بڑے لاابالیانہ انداز میں بولا ۔

ابے جا بھی ——— اسی کو تو سبھی کچھ کہہ رہا ہے یہ تو کچھ بھی نہیں ——— ہاں ان تراشوں میں کہیں تصویر بتاں اور حسینوں کے خطوط ہوں تو بتا دے عشقیہ افسانے ہوں تو نکال کر الگ رکھ دے ۔ انہیں ردی میں نہیں بیچا جا سکتا کیونکہ ان میں ہندوستان کا دل ہے اور میں دل کو ردی میں بیچنے کا قائل نہیں ———"

ظفر سے جلد مرعوب ہو جانے والا نوح بول اٹھا ۔

"بھئی واہ ——— کیا ہی خوب چلتی ہے اس کی زبان ۔ کتنی بے تکلفی ہے اس کی گفتگو میں ——— مگر میں ان تراشوں کو کسی صورت میں بھی ردی میں بکتا نہ دیکھ سکوں گا ۔"

ظفر نے پھٹ سے جواب دیا ۔

بڑے آئے نہ دیکھنے والے ——— ابھی دیکھ نہ سکنے کی بات ہی کیا ہے ۔ تم دیکھو گے اور کھلی کھلی آنکھوں سے دیکھو گے ۔ ان تراشوں کے ساتھ اگر تمھاری میری اور جلیل کی بی ۔ اے کی ڈگریاں بھی ردی میں نہ اٹھاؤں تو یار کا نام

ظفر محمد خاں نہیں ——"

نوح رونہاسا ہو کر بولا ——

"پاکستان اسکیم' راجگوپالاچاری فارمولے اور کرپس آفر پر میں آج کل کچھ ورک کر رہا ہوں۔ اسے نہ بیچو ظفر —— تمہیں اپنی چرب زبانی کی قسم "

ظفر نے بڑی بے دردی سے کہا۔

"جی۔ تجھے مکھن ذرا کم ہی لگتا ہے۔ تم چاہے گڑگڑاؤ چاہے آنسو بہاؤ مگر ایمان کی بات یہ ہے کہ اس قسم کی تصنیف اوقات کے بجائے کراس ورڈ، صابن، گھڑیوں، سگرٹوں اور فلموں کے اشتہارات پڑھا کرو۔ شاید کوئی "لکی نمبر" تمہاری قسمت میں ہو —— یا پھر سٹہ کھیلو۔ میں آج تمہارے لیے ردی کے پیسوں سے ایک ٹائمز آف انڈیا بھی لا دوں گا"

نوح عادتاً ظفر سے متاثر ہو گیا۔

"نہیں —— مجھے ٹائمز آف انڈیا کی ضرورت نہیں اس کے بدلے دلشاد ٹاکیز کے چوراہے والے مرہٹے حلوائی کے ہاں سے جلیبیاں لے آؤ —— یہی اچھا رہے گا"

ظفر نے ایک فرشی سلام کیا۔ اور ساری ردی بٹور کر دالان میں آ کھڑا ہوا —— اور ملکہ الزبتھ کے دربار میں جس طرح شکسپیر کھڑا ہو کر اپنا ڈرامہ سناتا تھا بالکل اسی شکسپیرین انداز میں اس نے ایک اچھا شعر بگاڑ کر یوں پڑھا۔

"کتنے کا چبینہ لائے ہو ——— ؟"

ظفر بولا -

بہت مہنگا۔ تمہاری سنائی ہوئی کہانی کی ہیروئین بیلا سے
بھی زیادہ مہنگا"

پھر ہم چبینہ کھانے لگے۔ چبینہ کھاتے وقت ہمیں مہندر کی یاد بہت
آئی۔ وہ بڑے شوق سے اسے کھاتا تھا۔ اور اس کو فخریہ ——— نہیں
طنزیہ میری فیورٹ ڈش (FAVOURITEDISH)
کہا کرتا تھا۔ خصوصاً اس کا وہ جملہ کہ اگر میں ہندوستان کا وائیسرائے
بھی ہو جاؤں تب بھی چبینہ کھاؤں گا۔ اور اسمبلی کی فوڈ کونسلوں کا افتتاح
بھی چبینہ سے ہی ہوگا ——— بہت یاد آرہا تھا۔ اس جملے میں ظرافت
کے بجائے ہندوستانی سیاست پر ایک شائستہ قسم کا استہزا بھی چھپا ہوا
تھا۔ ظفر نے ہمارے آہستہ آہستہ اٹھنے والے نوالوں کو دیکھ کر متنبہ کیا کہ
——— دیکھو۔ پہلے تو مجھے بہت بھوک لگی ہے۔ دوسرے یہ کہ
چبینہ کھانے میں میری رفتار تم دونوں سے زیادہ تیز ہے۔ بعد کو بدنام
نہ کرنا مجھے ——— مگر شوخ ظفر نے یہ جملہ آخری بچے کھچے دانوں
کا ایک ہی پھنکا مارتے ہوئے کہا تھا ——— ہم ہنس پڑے اور کیا کرتے۔؟

نوح نے کہا ———
بھیا۔ تم ورزش کرنے کی عادت چھوڑ دو۔ تم لاکھ ڈنٹر پیلو
اوسط عمر سے زیادہ نہ جی سکوگے۔ خواہ مخواہ ورزش کرتے ہو

اور اس مفلسی میں چار چار پیٹ کی بھوک کے برابر کھالیتے ہو بھلا
ہمارا بھی تو خیال کرو"
ظفر نے پانی کا چوتھا گلاس حلق میں انڈیل لینے کے بعد اطمینان سے نوح
کے بستر پر جوتوں سمیت دراز ہوتے ہوئے کہا ۔
"———— تم میں ایک کمزوری ہے ۔ تم ہمیشہ مجھ سے
کہتے ہو کہ کچھ ہمارا بھی تو خیال کرو ۔ دیکھو اس طرح گڑگڑانا
نہیں چاہیے ۔ مجھے کسی طرح مجبور کردو کہ میں تمہارا خیال کرنے
پر مجبور ہو جاؤں ———— بھیا یہ زمانہ عدم تشدد
کا نہیں ۔ تشدد کا ہے ۔
نوح نے یونہی مذاق میں پوچھا ۔
"بات سمجھ میں نہیں آئی ۔ مثال کے ذریعے سمجھاؤ"
ظفر سمجھا کہ نوح نے واقعی بات نہیں سمجھی اسی لیے بستر پر اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کمال
سنجیدگی سے سمجھانا شروع کیا ۔
دیکھو ———— یہ سامنے گھر میں تین روز پہلے جو اجنبی خاندان
آبسا ہے ۔ اس میں ایک لڑکی ہے ۔ رنگ تو دیسی ہے مگر ادائیں
ساری بدیسی ہیں ۔ جب سے آئی ہے ۔ کھڑکی سے جھانکتا دیکھا
کرتا ہوں ۔ مجھے جب کبھی دیکھتی ہے بلا تکلف بلا جھجک بے شرم
مسکرا دیتی ہے ۔ میں اس کی طرف دیکھنا بھی نہیں چاہتا لیکن وہ مجھے دیکھنے پر
مجبور کر دیتی ہے میں ایسی اسپرٹ کو پسند کرتا ہوں ۔

نوح ——— عورتوں کا متوالا ——— گھگھیاتے ہوئے بولا جیسے منہ میں
رال جمع ہو گئی ہو ———
" اسپرٹ کی ایسی تیسی ——— اور کچھ باتیں سناؤ اس
لڑکی کی ———"
ظفر نے معنی خیز نظروں سے نوح کی طرف دیکھا اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولا ۔
لو میاں ——— اک تیر وہ جگر میں ہے مارا کہ ہائے ہائے
مگر اس کو ان سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ تو مجھے ہی اپنی چوٹی کے
بالوں میں پھانسنا چاہتی ہے۔ آنکھوں کی پتلیاں ستاروں
کی طرح چمکاتی ہے جیسے میں کوئی اندھیرے میں بھٹکا ہوا مسافر
ہوں ۔ اور اس کی آنکھوں کے ستارے دیکھ کر اپنی راہ
ڈھونڈھ لوں گا ——— اس کی وجہ جانتے ہو ادھر کچھ
برسوں سے خلیج بنگال اور بحیرۂ عرب کی مانسون آسمان پر
کالے کالے بادل تو پھیلا دیتی ہے مگر دھرتی ایک ایک بوند
کو ترس گئی ہے ۔ اور گرمی ——— گرمی کا تو کچھ نہ پوچھو۔ اسی لیے
وہ لڑکی دسمبر میں بھی صرف سوسی کی قمیص اور چھینٹ کی
شلوار پہنے رہتی ہے ۔ اگر وہ روز ایک قمیص اور روز
ایک شلوار بدل سکتی ہے تو کیا ایک سوئیٹر نہیں خرید سکتی ؟
——— مگر مجھے اس بات سے نفرت نہیں مجھے اس کے
کالے رنگ سے نفرت ہے ۔ میں کہتا ہوں کہ ہمارے

ویسے کو نہ کلائیو نے غلام بنایا ہے اور نہ امیری غلام رکھنا چاہتا ہے
ہیں تو اس لڑکی کے اس سیاہ رنگ نے غلامی عطا کی
ہے ــــــ خدا بخشے سر راس مسعود سچ کہتے تھے کہ خدا غلام
بنائے مگر غلام کی صورت نہ بنائے ــــ"
نوح نے خواہ مخواہ ہی کان کھڑے کرتے ہوئے کہا۔
ارے دیکھیں تو سہی ــــ باہر کوئی آواز دے رہا ہے"۔
نوح کے ساتھ میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔
مگر ظفر نے میری قمیص کا دامن کھینچ کر مجھے پھر بٹھا لیا۔ نوح کے باہر
چلے جانے کے بعد ظفر مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔
ابے بیٹھ جا ــــــ کیا تجھے یقین ہے کہ باہر کوئی پکار رہا ہے
ارے ہمارے گھر پر کوئی بھکاری بھی آواز نہیں لگا سکتا ــ
ابھی میری استادی سے فیض حاصل کرو۔ سنو۔ مانسون کی برہمی
کا اثر نوح پر بھی ہوا۔ وہ بہانے سے باہر گیا ہے تاکہ سامنے والے
مکان کی کھڑکی میں اس لڑکی کو دیکھ لے۔ اگرچہ میں نے
اس لڑکی سے متنفر کرنے کے لیے یہ بھی کہا کہ اس کی رنگت
کالی ہے اور ادائیں بھونڈی ہیں مگر انسان کے دل میں جو کچھ
چھپا رہتا ہے وہ مچل گیا ہے۔ سمجھے؟ یار اب بھی اگر نہ سمجھے
تو خدا تم سے سمجھے یا نہ سمجھے میں تو تم سے ضرور سمجھ لوں گا"۔
میں کچھ حیران کچھ مرعوب ظفر کو ایسے دیکھنے لگا جیسے میں یونیورسٹی

کے ابتدائی زمانے میں بڑے بڑے پروفیسروں کی صورتیں لکچر کے وقت دیکھا کرتا تھا۔ مجھے ہنسی آئی۔ مگر ظفر نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسی دبا دی اور کہا کہ ابھی سے نہ ہنسو۔ ہنسنے کا وقت تو کچھ ہی دیر کے بعد آنے والا ہے تھوڑا سا صبر کرو"۔

بڑی دیر تک نوح باہر ہی کھڑا رہا۔ اور میں ظفر کی استادی کی دل ہی دل میں داد دیتا ہوا ایک اخلاق سوز ناول اٹھا کر پڑھنے لگا اور پڑھتے پڑھتے اونگھ گیا لیکن چند ہی لمحے بعد ظفر کی آواز نے میری غنودگی چھین لی۔

کامریڈ نوح ——— اب تو تم دن بدن بہت بڑے آدمی بنتے جا رہے ہو یعنی اتنے بڑے کہ لوگ اب تمہارے دوست بننے لگے ہیں۔ بھیا کم از کم میں تو اس کو بڑا آدمی سمجھتا ہوں جس کے دشمن کم ہوں اور دوست زیادہ۔ اور متوسط انسان وہ جس کے دوست کم دشمن بھی کم۔ رہے ہم لوگ تو ہمارے درجے کے پرولتاری انسانوں کا نہ تو کوئی دوست اور نہ کوئی دشمن ——— مگر یہہ بڑی مسرت کی بات ہے کہ تم بڑے آدمی بنتے جا رہے ہو۔

نوح کی ابرویں بل کھائی ہوئی تھیں جیسے وہ ظفر سے چڑا ہوا تھا۔

کیا بک رہے ہو ———"

ظفر نے انگاروں کو اور ہوا دی۔

میں یہہ بک رہا تھا کہ تمھارے دوست نے تمھارے ساتھ

باہر ایک گھنٹے تک آخر ایسی کیا باتیں کی ہیں؟ اگر راز نہ ہو تو
ہم بھی سنیں ـــ"
نوح نے تڑپ کر کہا ـــ
"چپ رہو ـــــ میں تمھاری ساری بد معاشی کو جانتا ہوں"
ظفر مصنوعی غصے سے گرجنے لگا ـ
"اور یہ آپ کی نیک معاشی ہے کہ آپ بہانہ بنا کر میری محبوبہ کو
دیکھنے باہر چلے گئے اور ایک گھنٹے تک اس سے کھیلتے رہے ـ تم
دوستی میں رقابت کا زہر ملانا چاہتے ہو ـ مجھے تم سے ایسی امید
نہیں تھی"
میں مسکراتے ہوئے ظفر کی اس لاجواب غصیلی ایکٹنگ کو دیکھ دیکھ کر سوچ رہا
تھا کہ بھئی واہ کیا مست آدمی ہے ـ کتنی مجبور دکھی اور فلاکش زندگی گزار رہا
ہے مگر اس کے چہرے، اس کی مسکراہٹوں اور اس کی باتوں سے کوئی اندازہ
لگا سکتا ہے کہ اس کی زندگی کسی مفلس کی قبا کہی جا سکتی ہے ـــــ!
نوح کھسیاتے ہوئے کہہ رہا تھا ـ
"ظفر ـــ دیکھو تمہیں غلط فہمی ہو رہی ہے ـ پہلے میری بات
تو سنو"
ظفر نے غصے سے اٹھتے ہوئے اپنی شیروانی کھونٹی سے اتاری اور پہننے کے بجائے
کندھے پر ڈال کر رقت آمیز لہجے میں کہنے لگا ـــــ
"میں اب کچھ نہیں سننا چاہتا ـ مجھے معاف کر دو ـ تمھارے

مجھ پر بہت سے احسانات ہیں۔ میں ان کو زندگی بھر نہ بھول سکوں گا
میں اب ہمیشہ کے لیے اس گھر کو چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ جھندر کی طرح
نہیں۔ اس نے ایک عورت کی خاطر اپنے دوستوں کو چھوڑ دیا۔
میں اب اپنے دوست کی خاطر عورت کو چھوڑ رہا ہوں۔ میری
محبوبہ اب تم کو مبارک ہو۔ نوح —— اگر تم چاہو تو اس سے کہو
کہ وہ تم سے نفرت کرتا تھا اس لیے چلا گیا۔ آؤ نوح میرے گلے سے
لگ جاؤ۔ آؤ جلیل آخری بار پیار کرلیں ——
ظفر نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے نوح کو اور مجھے ایک ساتھ گلے سے لگا لیا اور
پھر تیز تیز قدم اٹھاتا باہر چلا گیا —— نوح کہہ رہا تھا۔ ارے سنو تو ——
بات تو سنو ظفر —— ظفر۔ ۔ ۔ ۔ ظفر۔ ۔ ۔ ۔ ۔

پرستیدم

چوربارار

الف لیلیٰ کی شہزادی

ظفر کے چلے جانے کے بعد نوح سر پکڑ کے دالان کی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔ اب اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اور بھرائی ہوئی آواز میں بڑبڑا رہا تھا۔

جاؤ ——— ہمیشہ کے لیے چلے جاؤ۔ مگر مجھ پر رقابت کا الزام نہ لگاؤ۔ رقابت کے بجائے اس کو قربت کہو اسی قربت کی وجہ سے ہم ایک دوسرے سے اب تھک گئے ہیں۔"

میں نے نوح کو دلاسا دینا چاہا۔ مگر اس نے مجھے بھی جھڑک دیا۔

جاؤ ——— تم بھی اپنا منہ کالا کرو۔ مجھے اب تم سے بھی نفرت ہو گئی ہے۔ خدا جانتا ہے کہ یہ رقابت کا عذاب ہے یا قربت کا ———؟ جلیل۔ تم بھی میرے گھر سے نکل جاؤ دوست اسی وقت تک بہت پیارا نظر آتا ہے جب تک وہ دور سے دکھائی دے مگر نزدیک آنے پر اس کا چہرہ دشمن کی طرح بھیانک نظر آتا ہے۔"

نوح کے ان جملوں سے مجھے تکلیف سی ہوئی اور میں نے چپ چاپ اپنا بستر لپیٹنا شروع کر دیا۔ مجھے بستر لپیٹتا دیکھ کر نوح گھبرا گیا۔ اور جانے کیا

سوچا کہ دوڑا ہوا میرے پاس آیا اور گڑگڑانے لگا۔

"جلیل ——— تم نہ جاؤ۔ خدا کے لیے نہ جاؤ۔ میں نے یونہیں طیش میں کہہ دیا۔ میں ایمان سے کہتا ہوں کہ اس سامنے والے گھر میں کوئی لڑکی وڑکی نہیں ہے۔ میں اس وقت اس گھر ایک فرضی پتہ پوچھنے گیا تھا۔ اندر سے ایک بوڑھا باہر آیا۔ میں نے ادھر ادھر کی باتوں کے بعد سب معلوم کر لیا کہ اس گھر میں اس "پیر تسمہ پا" اور اس کی چالیس سالہ رفیقہ کے سوا اور کوئی نہیں رہتا ——— وہ مسخرا ظفر جھوٹا ہے۔ تم اس کی باتوں کا یقین نہ کرو ——— دیکھو جلیل مان جاؤ۔"

اچانک ظفر کی چمکارتی ہوئی آواز باہر سے سنائی دی ———

ہاں ہاں جلیل ——— مان جاؤ ——— اچھے لوگ ضد نہیں کرتے ——— چو چو ——— مان جاؤ۔"

ظفر میری ٹھوڑی کو بچے کی ٹھوڑی کی طرح سہلا رہا تھا۔ میں اب اس سے کیسے کہوں کہ بھئی میں مان گیا۔ اب ٹھوڑی سہلانا چھوڑ دے ——— نوح کا غصہ اب غائب ہو چکا تھا اس نے کہا۔

ٹھہر و بدمعاش ——— تم اس طرح نہ مانو گے۔"

وہ دوڑا ہوا اندر کمرے میں گیا اور ایک ہاکی اسٹک لیے باہر لپکا۔ ہاکی اسٹک کو دیکھ کر بظاہر ڈر کر ظفر غسل خانے میں چھپ گیا۔ نوح نے غسل خانے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ اور کنڈی چڑھا دی۔ ظفر لاکھ چیختا رہا۔ مگر سزا

کے طور پر نوح نے ظفر کو شام تک غسل خانے میں قید رکھا۔ شام کو جب اسے رہا کیا گیا تو روٹھ کر لڑ پڑنے کے بجائے خلاف توقع وہ نوح کے گلے سے لپٹ گیا۔

یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ لڑائی اور صلح سب کچھ ڈھونگ تھا۔ ہم تینوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ جانے کیوں ——— ؟ ہم نے بڑی دیر تک آنکھوں سے آنسو نہ پونچھے۔ بلکہ چپ چاپ ایک دوسرے کے گالوں پر بہتے ہوئے یہ آنسو دیکھتے رہے۔ ان آنسوؤں میں کیا کیا نہ تھا ——— کاش اس وقت کوئی مصور ہم تینوں کی تصویر کھینچتا اور وہ تصویر ہندستان کی موجودہ سیاسی تاریخ میں لگا دی جاتی ———

رات ہو رہی تھی۔ ہم تینوں کے دل ہلکے ہو گئے تھے۔ عرصہ کا رکا ہوا سیلاب غم بہہ گیا تھا۔ نوح نے اسی لیے تجویز پیش کی ———

یار آج یونائیٹڈ ریستوران چلیں گے۔ اور خوب پیٹ بھر کر کھانا کھائیں گے۔ اگلی پچھلی ساری بھوک بیباق کر دینگے ظفر نے جو رقم بھیجی ہے اس میں سے ساڑھے پانچ روپے بچ گئے ہیں ——— چلو"۔

میں نے کل طلوع ہونے والے دن کو یاد کرتے ہوئے کہا۔

"مگر کل کی بھی کچھ فکر ہے ——— ؟"

ظفر بولا ———

جلیل ——— حضرت ناصح تو استاد داغ کے ساتھ ہی ہندستان سے اٹھ گئے۔ اب انہیں قبر سے اٹھنے کی زحمت نہ دو۔ ہماری

جماعت کا قانون تم شاید بھول گئے۔ ماضی، حال یا مستقبل کا نام لے کر میں نے کیسی کیسی سزائیں اٹھائی ہیں مگر آج میں تمھیں معاف کرتا ہوں۔ آج ہم سزا و جزا کے قائل نہیں ہیں اس لیے تمھیں آیندہ احتیاط کا مشورہ دیتے ہیں۔

میں نے ظفر کو صاف اڑا دیا۔

مَش ——— میں اب اتنا عاجز ہو گیا ہوں کہ اس فاقہ مستی کے خلاف جہاد کرنے پر مجبور ہوں۔

نوح نے کہا ———

یار میرے ——— تم بھول رہے ہو کہ تم ایک انسان ہو اگر ہندوستان نے تم سے یہہ احساس چھین لیا ہے تو تم خود کو اس انگریز مصنف سے رجوع کر لو ——— جس نے زندگی کی ساری رجائیت کو ایک ہی جملے میں کس خوبی سے سمویا ہے۔ "کل کے بارے میں نہ سوچو۔ کل اپنی فکر خود کر لے گا۔"

میں چیخ پڑا۔

"یہہ ذہنی غلامی ہے ——— تم ٹیگور سے کیوں نہیں رجوع کرتے ——— اس نے زندگی کی اصلی رجائیت کو اس جملے میں انگریزی مصنف سے زیادہ نفاست سے سمویا ہے۔" رات کو بھوکا سونا اچھا ہے بہ نسبت اس کے تم صبح قرض میں اٹھو۔"

ظفر بولا ———

یہہ رجعت پسندی ہے "۔
نوح بیساختہ ہنس پڑا۔ اور ظفر نے کھونٹی سے میری شیروانی اتار کر میرے کندھے پر پھینک دی۔ اور میرا مذاق اڑانے کی خاطر سولا ہیٹ سر پر پہنا دی جو کبھی کبھار چولھا گرم کرتے وقت کوئلوں کو ہوا دینے کے لیے استعمال کی جاتی تھی۔
میں نے اس ہیٹ کو نفرت سے چولھے کیطرف پھینکتے ہوئے کہا۔
" ہاں ــــ چلو۔ واقعی چلو۔ کیا جانے کل کا دن طلوع ہو یا نہ ہو۔ کیوں نہ محمد شاہ رنگیلے کیطرح ــــ ایک جام اور میری جان ــــــ فقط ایک ہی جام اصلی رجائیت تو یہی ہے۔

فاقہ مستی

یونائیٹڈ ریستوران میں ایسی تیز روشنیاں جل رہی تھیں کہ ہماری ہمیشہ اندھیرے کی عادی آنکھیں جھپکنے لگیں۔ اور میں تو کچھ ایسی بے چینی محسوس کر رہا تھا جیسے کوئی مجرم ہوں اور دھکیل کر منظر عام پر لایا گیا ہوں ہماری میلی کچیلی شیروانیوں الجھے بکھرے بالوں اور بے آب چہروں کی وجہ سے ریستوران کا بدمست شرابی تک ہمیں حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ انگریز اور اینگلو انڈین چھوکریاں ہم لوگوں کی اس جرأت پر —— یعنی یونائیٹڈ ریستوران میں جو ایک امریکن ریستوران تھا، داخل ہونے کی جرارت پر ہلکی ہلکی طنزیہ مسکراہٹوں سے ہمیں دیکھ رہی تھیں۔ یہ اژدہام نظر ... میری تو حالت اس نئی نویلی بیسوا چھوکری سی ہو رہی تھی جو پہلی بار اپنے گاہکوں کے سامنے ڈھکیل دی گئی ہو۔

سارے ریستوران کی آنکھیں ہمیں دیکھ رہی تھیں اور نہیں دیکھ رہی تھیں تو بیروں کی نظریں —— بیرے جنہیں اس ریستوران میں سب سے زیادہ ذلیل اور کمتر انسان سمجھا گیا تھا آج ان میں بھی ہمیں دیکھ کر یک بیک احساس برتری پیدا ہو گیا تھا اور واقعہ بھی یہی تھا کہ بیروں کی شیروانیاں اتنی سپید

تھیں کہ ان سے خدمت لینے کو خود ہماراجی بھی نہ چاہتا تھا ——— ہندوستان نے سب کچھ کھو دیا۔ اپنی حکومت، اپنی سیاست، اپنی معاشرت، اپنا تمدن، اپنا آرٹ، اپنا علم، اپنی عزت، اپنی عصمت، اپنا جسم اپنی روح ——— لیکن اپنی سفید پوشی کو قبضہ و اختیار سے جانے نہ دیا۔ کتنے ہی ایسے معزز خاندان کے لوگ ہیں اپنے گرد و پیش نظر آجاتے ہیں جنہوں نے اپنے بھوکے پیٹ اپنے زخمی دل اپنے غیور ضمیر کو سفید پوشی کی اوٹ میں چھپا رکھا ہے ——— ہندوستان ابھی اتنا بیباک کہاں ہوا کہ وہ جانوروں کی کھال سے مشابہ وردیاں پہن کر وہ سب کچھ کرے جو ایک انسان کے نام پر کلنک کا ٹیکہ لگا دے۔ دنیا کے ہر ملک کے انسان آئے دن یورپ اور وسطِ ایشیا کے میدانوں میں، اطلانٹک اور بحرالکاہل کے سمندروں میں اپنی جسمانی اور روحانی موت کے حلق میں گرتے جارہے ہیں لیکن ہندوستان کا انسان ابھی نہیں مرا ——— وہ انسانوں کے خون سے اپنی قمیص رنگ کر سرخ قمیصیے کا مکروہ لیبل نہیں چاہتا۔ کالی قمیص پہن کر انسانی سیہ بختی کا پیغام بر نہیں بننا چاہتا ———

ظفر نے تنگ آکر کہہ دیا "بھئی ——— ان بیروں کی سفید پوشی اور کونے پر دل فریب مسکراہٹ سے دیکھنے والی فرنگی مالکن کو دیکھ تو مجھے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میں ہندوستان کا کوئی تاریخی فلم دیکھ رہا ہوں۔"

میں نے کہا ——— بھئی یہاں سے چلو ——— پہلے تو کوئی بیرا "لفٹ" دیتا نظر نہیں آتا۔ دوسرے یہہ کہ کونٹر پر بیٹھی ہوئی اس فرنگن کی مسکراہٹ میں کچھ طنز معلوم ہوتا ہے۔"

نوح نے جواب دیا۔ یار اب آ ہی گئے ہیں تو یہاں سے یونہی چلے جانا حماقت ہے ——— لوگ ہنسیں گے۔

ظفر نے چڑ کر کہا :۔ تم کو تو بس لوگوں کی زبان، ان کی ہنسی اور ان کے تیوروں کی فکر پڑی رہتی ہے ——— اگر تمھیں لوگوں کی ہنسی کی پرواہ نہ ہوتی تو شاید تم اس طرح بیکار نہ رہتے۔"

اسی اثناء میں ایک بیرا میز کے قریب آیا۔ ظفر نے اپنے آپ کو بھول کر بیرے کو حکم دیا۔

"دیکھو ——— کٹلٹس اور مٹن چاپس لے آؤ۔"

ظفر میں اس کے جد امجد آصف الدولہ کے وزیر کے لہو کا شاید ایک قطرہ بچ کھچ کر رہ گیا تھا جو اس کے دماغ کی شریان میں رینگ آیا تھا۔ اس لیے بوائے کے چلے جانے کے بعد نوح نے گھبرا کر کہا ———

" ارے ظفر ——— یہہ کیا بیہودگی ہے۔ تمھاری جیب میں صرف ساڑھے پانچ روپے ہیں اور یہہ ریستوران امریکی ہے ! ——— کٹلیٹس اور مٹن چاپ سے کیا ہوگا اس کے بجائے چاول کی پلیٹیں منگوا لیتے۔"

میں نے نوح کی تائید کی :۔ ہاں جی ——— اس ہوٹل میں ہندوستانی سپاہیوں کے لیے خاص طور پر چاول پکتا ہے ———

اور سنا بھی۔ تم تو یار بدھو ہو ظفر ــــــ شاید اس کو بھی یونیورسٹی
ریستوران سمجھ رکھا ہے کہ خوب پیٹ بھر کر کھا لیا۔ منیجر کے پاس
کمرہ نمبر نوٹ کرایا اور چلتے بنے ــــــ"
ظفر کچھ نادم سا ہو گیا تھا۔ مگر جد امجد کے لہو کا تموج ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ! اس نے
بھونڈی سی صفائی پیش کی ۔
"ہم سپاہی تو نہیں ہیں ــــــ !"
بیرے نے کٹلٹس اور مٹن چاپس سامنے رکھ دیے اور ہم نے ہندوستانی
بھیڑوں کے گوشت سے بنائے ہوئے ان گرم گرم سوندھے کٹلٹس اور مٹن چاپس
میں ولایتی کانٹے اور چھریاں چلا چلا کر پلیٹوں میں خالی ہڈیاں چھوڑ دیں
ــــــ کم سخن نوح کو ایک عرصے بعد ایسی لذیذ غذا ملی تھی اس لیے وہ
بھی آج باتونی ہو گیا تھا ــــــ وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگا ۔
"یہ پلیٹ ہندوستان ہے"
ظفر نے جواب دیا : ۔ مٹن چاپس میں تم نے سرکہ ذرا زیادہ
ڈال دیا تھا اور اب اسی الجھی سُرور میں تمھیں ایک ایک چیز میں
ہندوستان نظر آئے گا لیکن ٹھیرو ــــــ ابھی سارا نشہ
ہرن ہو جائے گا ۔"
اس نے بیرے کو بل لانے کی آواز دی ۔ بیرا بل سامنے رکھ کر چلا گیا تو واقعی
ہم سب کا نشہ ہرن ہو گیا۔ نشہ اُتارنے کے لیے صرف تلخی ہی کی کیا ضرورت ہے۔
نوح نے ڈانٹ کر ظفر سے پوچھا۔ "کیوں جی ــــــ اب ــــــ

یہہ مزید ایک روپیہ کہاں سے آئے گا ——— ؟"
ظفر بوکھلایا ہوا تھا مگر اپنی بیوقوفی کو بہر صورت نباہنا چاہتا تھا۔
" بھیّا ——— یہہ امریکن ریستوران ہے۔ غفور رسے کا بھٹیار خانہ سمجھ رکھا ہے کیا ——— اور جناب نوح صاحب آپ نے ابھی ابھی فرمایا تھا کہ یہہ پلیٹ ہندوستان ہے ——— آپ نے بالکل بجا فرمایا تھا۔"
مجھے غصّہ آگیا ——— میں نے کہا ——— "یہہ مسخرگی چھوڑو ——— اب کچھ کرنا چاہیئے۔"
نوح نے بھی کہا ——— "ہاں ہاں ——— کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ دیکھو ایک ترکیب ذہن میں آئی ہے۔ یہاں سے اس سونے کی چڑیا کا پنجرہ جس میں مہندر رہتا ہے قریب ہی ہے ——— ظفر تم جاؤ اور اس سے کچھ قرض مانگ لاؤ۔"
ظفر مہندر کے پاس نہ جانا چاہتا تھا لیکن میری تمنا تھی کہ ظفر ہی اس کے پاس جائے کیونکہ وہ ظفر ہی سے ناراض ہوکر گیا تھا۔ اس طرح ایک تیر سے دو شکار ہوں گے ——— پیسہ اور تجدید دوستی۔
ظفر ایک سعادت مند بھائی اور ایک صاف دل دوست کی طرح اٹھ کر چلا گیا۔ اس کی واپسی تک ہم ایسا محسوس کرتے رہے جیسے کرسیوں کی بید نوکدار کانٹوں میں بدل گئی ہے ——— ظفر آدھ گھنٹے بعد دروازے ہی سے مسکراتا، اکڑتا قریب آیا اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگا ———

بتاؤ کیا کھاؤ گے ـــــ ؟ مجھے چاول پسند نہیں ہیں تو کٹلٹس
اور مٹن چاپس ہی کھاؤں گا"
نوح نے خوشی سے مسکراتے ہوئے پوچھا ـــــ پہلے یہ تو کہو
کتنے ملے ـــــ ؟"
ظفر نے اس کی طرف نفرت سے دیکھتے ہوئے کہا:۔ تم چپ رہو
ـــــ تم ایک ذلیل انسان ہو۔ مہندر نے مجھے سب کچھ
بتا دیا ہے ـــــ"
نوح نے اس کو مذاق سمجھتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔ بھلا کیا بتا دیا
مہندر نے ـــــ ؟"
ظفر نے کہا:۔ وہ سب ـــــ جس کی مجھے خواب میں بھی
تم سے امید نہ تھی"
میں دونوں کے تیور تاڑ گیا۔ اور بات کو آئی گئی کرنے کے لیے کہا۔
یار ظفر ـــــ تمہارے مذاق عموماً بیہودگی پر ختم
ہوتے ہیں۔ مہندر تمہاری ہی وجہ سے ہم کو چھوڑ کر چلا گیا۔
ـــــ اب چاہتے ہو کہ نوح بھی ہمیں چھوڑ دے ـــــ"
ظفر نے بیرے کو بل ادا کرتے ہوئے کہا:۔ اچھا ـــــ اب
باہر نکلو ـــــ ہمارا ایک دوسرے کو چھوڑ دینا ہی اچھا ہے"
ریستوران کی چکا چوند کر دینے والی روشنی سے نکل کر جب ہم بلیک آؤٹ
کی ماری اندھیری سڑک پر آ گئے تو آنکھوں کو جیسے طراوت محسوس ہونے لگی

——— مجھے تو اندھیرا بہت پیارا لگتا ہے ——— اندھیرے میں یوں محسوس کرتا ہوں جیسے بالکل آزاد ہوں جو چاہوں کروں چاہے کمر میں خم دے کر چلوں چاہے ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ کر چلوں ——— تنظیم مابعد جنگ کی اسکیم میں اگر میری رائے کو وقعت دی جائے تو میں بتاؤں کہ انسان کو نہ جمہوریت چاہیے نہ اشتراکیت ——— دن میں بھی ساری دھرتی پر اندھیرا ہی اندھیرا مسلط کر دو۔ اندھیرے ہی میں مکتی ملتی ہے۔ اندھیرے ہی میں صحیح اصلی آزادی ہے۔

نوح ظفر کی باتوں سے جیسے کچھ بے چین تھا۔ اس لیے بار بار پوچھ رہا تھا۔

"ہاں تو میں نے تمھارے ساتھ کیا بیوفائی کی ہے ظفر ———؟"

ظفر پہلے تو خاموش چلتے ہوے اس کو اڑاتا رہا لیکن جب نوح مکھی کے مانند بار بار بھنبھناتا گیا تو اس نے چڑ کر کہا ———

"لو سنو ——— مگر افسوس ہے کہ میں اندھیرے کی وجہ سے تمھاری خجالت سے بھیگی ہوئی پیشانی نہ دیکھ سکوں گا ——— تم آج دوپہر مہندر کے گھر گئے تھے اور اس سے یہہ کہا تھا کہ ظفر کو شدید بخار ہو گیا ہے۔ دوا کے لیے پانچ روپے قرض دیدو ——— بتاؤ وہ کون ظفر ہے جو بخار میں ایڑیاں رگڑ رہا ہے۔ اور کہاں ہیں وہ پانچ روپے ———؟"

نوح نے جواب دیا: "ظفر ——— مذاق کی ایک حد ہوتی ہے۔ بیہودگی نہ کرو آج دوپہر تو میں اور جلیل ایک عورت کے تعاقب میں شام

تک گھومتے رہے ـــــ ایک لمحے کے لیے ایک دوسرے سے جُدا نہ ہوئے۔ تم جلیل سے پوچھ سکتے ہو۔"

میں بھی حیران تھا۔ بولا۔ ہاں ہاں ـــــ آج دوپہر نوح ایک لمحہ کے لیے بھی مجھ سے جدا نہ ہوا۔"

ظفر چلتے چلتے رکا اور پوچھا:۔ تو کیا مہندر نے جھوٹ کہا ـــــ اس کی گفتگو سے تو ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ بائیبل اور قرآن کی زبان میں بات کر رہا ہو۔ اس نے کہا بھئی میں خود مجبور ہوں۔ میرا ہر چھوٹا بڑا خرچ وہی اٹھاتی ہے پھر میرے پاس پیسے کہاں ـــــ اس کو ڈر ہے کہ اگر میرے پاس پیسے رہیں تو میں اس کے پنجرے سے اڑ جاؤں گا ـــــ بھلا میری شامت آئی ہے جو اڑ جاؤں ــــ مگر صیاد اور آقا میں بہادری اور جرأت بھی کچھ ہوتی ہے لیکن خود اعتمادی نہیں ہوتی ـــ اسی لیے اس عورت نے میری انگلی میں پہنائی ہوئی ہیرے کی انگوٹھی نکال لی ہے کہ کہیں انگوٹھی بیچ باچ کر بھاگ نہ جاؤں ـــــ وہ گھر کا بڑا پھاٹک بھی ہمیشہ مقفل رکھتی ہے۔

ظفر پھر چلنے لگا اور بولا: "مگر یار ـــــ جس وقت میں گیا تھا۔ گھر کا پھاٹک کھلا ہوا تھا وہ عورت بھی گھر پر نہیں تھی اور مہندر اپنی انگلی میں چمکتی ہوئی انگوٹھی کو بھی نہ چھپا سکا تھا۔

نوح نے ظفر کو بدلہ لینے کے لیے چھیڑا:۔ نہیں جی ــــ پھاٹک کو

قفل تھا۔ وہ عورت بھی گھر پر تھی اور مہندر کی انگلیوں میں
کوئی انگوٹھی نہیں تھی۔ کیوں جلیبل تم نے دیکھا ہے نا ——؟
میں نے نوح کا طنز سمجھتے ہوئے جھوٹ موٹ کہہ دیا۔
"ہاں ہاں دیکھا ہے ——!"
ظفر بھی نوح کے جملے کا طنز سمجھ گیا اور پہلی بار اپنی شکست جلدی
سے مان لی:۔
مجھے معاف کر دو نوح —— میں بے حد شرمندہ ہوں
حیرت ہے کہ میرے دماغ کو کیا ہو گیا ہے —— یہ سارا قصور
کہیں کٹلیٹس اور مٹن چاپس کا تو نہیں ——"
میں نے کہا:۔ تم بالکل ٹھیک کہتے ہو —— سارا قصو
کٹلیٹس اور مٹن چاپس ہی کا ہے —— کٹلیٹس اور مٹن چاپس
کھانے والے ذرا گھٹل دماغ کے ہوتے ہیں —— یاد ہے
تمہیں وہ ہز ہالونس (HIS HOLLOWNESS) جو
اپنے ہوسٹل میں تھا۔ کسی دیسی ریاست کے جاگیردار کا ولیعہد
—— انٹرمیجیٹ میں پڑھتا تھا۔
ظفر نے کہا:۔ اچھا —— وہ مُچند —— بھئی
وہ زندہ نہیں تو خدا مغفرت کرے کیا خوب آدمی تھا۔ ہوسٹل
کے بیروں نے سالے کو خوب جی بھر کے ٹھگ لیا۔ اس کے
قصے تو ہوسٹل کا ہر کوئی کبابی سناتا تھا۔ کچھ ——"

مجھے جاگیرداروں سے بڑی ہمدردی ہے۔ اسی لیے میں نے الف لیلی کی کہانیاں سننے کے شوقین بادشاہ کی طرح پوچھا۔

بھئی ہم بھی سنیں کیا قصہ ہے وہ "رفو کبابی اور جاگیردار کے ولی عہد کا ——— ؟"

گھر قریب آرہا تھا ——— ظفر کو نیند آرہی تھی اس نے اڑاتے ہوئے کہا

"قصہ کیا ——— وہ کباب بڑے شوق سے کھایا کرتا تھا اور سارے جاگیردار کباب شوق سے کھاتے ہیں۔ اب تو صاحب مہینے کے ختم پر اس کو حساب سمجھایا کرتے تھے ——— ساڑھے تین آنے اور ڈھائی آنے۔ ڈھائی آنے اور سوا دس آنے ——— سوا دس آنے اور پونے پندرہ آنے ———

لیجئے صاحب۔ ولی عہد بہادر کھا گئے چکر ان کو یہ اڑھائی سوا، پونے اور ساڑھے کا حساب نہیں آتا تھا۔ اور رفو صاحب اس میں اپنی ساری مہارت صرف کر دیتے تھے ——— وہ تنگ آکر اپنی انگریزی اور اردو ملی زبان میں کہتا ———

" اہاں ٹوٹل بتاؤ ——— ٹوٹل "

رفو صاحب نے پھر شروع کیا۔

"پانچ روپے ساڑھے سات آنے اور سوا دو پیسے"۔

پھر وہی ساڑھے اور سوا ——— اب یہ ولی عہد بہادر کے شایان شان

نہ تھا کہ وہ اتنے ہی پیسے دیتے جتنے کا حساب ہوتا ۔۔۔ سبھی لڑکے تو یوں ہی دیتے ہیں مگر رفو کیا کہے گا ۔۔۔۔۔ کہ اتنے بڑے ولی عہد بہادر اور کمرہ نمبر ۳۰ کے بیر تھی میر میں کوئی فرق نہیں ۔۔۔۔۔ ایسا کرنے سے سارا جاگیر دارانہ نظام خطرے میں پڑ جائے گا ۔ یہہ مساوات یا اشتراکیت ایک جاگیر دار کیسے برداشت کر لے ۔۔۔۔۔ ؟"

ہم سب ہنسنے لگے اور ہنستے ہنستے ہی گھر کے دروازے میں داخل ہو گئے ۔۔۔ کاش ہم زندگی کے دروازے میں بھی ایسے ہی ہنستے ہوئے داخل ہوتے ! ۔ جب ہم صبح تک مرنے کے لیے بستر جھاڑ رہے تھے تو اچانک ہمسایہ کے گھر سے اتنی دردناک اور ڈراونی چیخیں اٹھیں کہ ہم سہم گئے ۔ اور وہ گفتار کا غازی باتوں کا سورما ظفر چادر جھاڑنے کے بجائے اسی کو اوڑھ کر دہیں دبک گیا ۔ یہہ چیخیں ایک عورت کی تھیں ۔۔۔۔ غالباً کسی لڑکی کی تھیں کیونکہ آوازیں ابھی جیسے کنوارپن کی لطافت تھی ۔ ہم نے آج تک اس ہمسایہ گھر سے کوئی نسوانی آواز نہ سنی تھی ۔ البتہ چیزیں اٹھانے رکھنے ، برتنوں کی کھڑکھڑاہٹ اور کبھی کبھی مردانی آوازیں اور ان کی کھانسیاں ضرور سنائی دیتی تھیں ۔ اس سے زیادہ ہمیں اس ہمسایہ گھر کے اور کوئی معلومات نہیں تھے ۔ ہم نے خود بھی کبھی یہہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی تھی کہ ہمارے ہمسایہ کون ہیں ۔۔۔۔ ؟ کیونکہ ہم سب کا متفقہ خیال تھا کہ ہمسائیگی اتنی ہی بے مطلب اور بے مصرف چیز ہے جتنا کہ خود سایہ ۔۔۔۔

یں کرب و اضطراب دکھ اور درد کی ان چیخوں کو برداشت نہ کرسکا اور ظفر و نوح سے کہنے لگا۔

"یار چلیے چلو ——— ہوسکے تو کچھ مدد کردیں ان کی"

ظفر نے چادر کے اندر ہی سے کہا:— نہیں مت جاؤ — وہ شائد اب مر رہی ہے۔ اس کو مرنے ہی دو ——— اس طرح یہ چیخ چیخ کر بسور بسور کر زندہ رہنے کے بجائے اس کا مر جانا ہی اچھا ہے۔"

مجھے غصہ آگیا اور میں نے بے تاب ہو کر کہا:— تم لوگ آؤ یا نہ آؤ ——— میں تو جاؤں گا۔ میں ان کی ضرور مدد کروں گا —

یہہ کہتے ہوئے میں تیزی سے باہر نکل گیا ۔

ہسٹیریا

اس گھر کے دروازے پر ہی میری ایک بوڑھے سے ٹکر ہو گئی۔ اس کی جھریوں میں آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ مجھے دیکھتے ہی چیخ اٹھا۔

"کمینے ـــــ تم ہی میرے ہمسائے ہو۔ تم ہی نے میری اکلوتی لڑکی کی جوانی کو ستایا ہے ـــــ ؟"

اوہ یک نہ شد دو شد والی بات ـــــ! میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"قبلہ ـــــ میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھا۔"

بوڑھا دردناک آواز میں روتا ہوا بولا: "مطلب نہیں سمجھا ـــــ تو اب سمجھ لے ـــــ سن یہ آوازیں سن ـــــ میری بیٹی کی جوانی پکار رہی ہے۔"

"اندر سے وہی آواز جو کچھ دیر پہلے چیخیں تھی سنائی دے رہی تھی۔

"میرا شوہر تو اس دیوار کے ادھر رہتا ہے۔ میں آنگن کی دیوار کے سوراخ سے روز اس کو دیکھتی ہوں ـــــ میرا پیارا ـــــ بڑا ظالم ہے وہ ـــــ اس نے مجھے آج تک نہیں دیکھا۔ اس کے قہقہے مجھے بہت پسند ہیں ـــــ ماں جی ـــــ

"بوڑھے صلاح الدین سے میری شادی نہ کرو ——
میں نے تو اپنے شادی کر لی —— ہاں کر لی ہے بہت
دِن پہلے — جب —— جب بوڑھا صلاح الدین ابھی
پیدا بھی نہ ہوا ہو گا ——"
لڑکی شاید ہوش میں نہ تھی اور اسی وجہ سے اس طرح کھل کر بڑبڑا رہی تھی۔
بوڑھے کو سمجھانے منانے میں بڑی دیر لگی اور میں اپنے آپ کو جھوٹ
موٹ میڈیکل کالج کا طالب علم بتاتے ہوئے بوڑھے کے ساتھ اندر گیا۔
لڑکی کے سارے جسم کو ایک کمبل سے ڈھانپ دیا گیا۔ صرف ایک سفید
گول گول موٹی نورانی شعاع سُرخ سُرخ چوڑیوں سے گزرتی چارپائی
کے نیچے لٹک رہی تھی۔ میں نے اس لڑکی کی نبض دیکھی —— لڑکی
ہذیانی کیفیت میں برابر بڑبڑا رہی تھی ——
ہاں جی —— ماجی دیکھو تو منّے نے شیشہ توڑ دیا
—— اری آپا تو پھر راکھ سے برتن مانجھ رہی ہے ——
اری سُن —— میرا پیارا کیسے زور زور کے ٹھٹھے لگا رہا ہے
اس کے ٹھٹھے —— اوئی مجھے بھی گدگدا رہے ہیں۔ ہی ہی
ہی ہی۔ ——————
میں سمجھ گیا کہ لڑکی کو کیا بیماری ہے۔ ابھی دوا لانے کا وعدہ کر کے
میں باہر آ گیا —— باہر آ کر میں نے بوڑھے سے پوچھا۔
لڑکی کی عمر کیا ہے —— ؟

"تقریباً چھبیس سال۔"

"شادی ہو چکی ہے ——؟"

بوڑھا ایک ٹھنڈی سانس لے کر چپ ہو گیا۔ اندر سے ایک کبڑی بڑھیا باہر آئی۔ اور روتے ہوئے کہنے لگی۔

"بیٹا —— تم اس وقت فرشتہ بنکر آئے ہو اب تم سے کیا چھپانا —— تین ناطے جڑ کر ٹوٹ گئے —— تین بار تین آکر لوٹ گئیں —— تم ہی بتاؤ۔ کہاں سے اس کے گلے میں سونے کا ہار پہنادوں۔ اس کی کلائیوں کے لیے چاندی کے کنگن کہاں سے لاؤں —— اب ایک جگہ بات طے ہوئی ہے"۔

میری آنکھوں میں جانے کیسے آنسو امنڈ آئے بھرائی ہوئی آواز میں میں نے کہا —— "ہاں جی —— تم فکر نہ کرو۔ ابھی دوائی لاتا ہوں بہن بہت جلد ٹھیک ہو جائے گی"۔

بڑھیا نے کہا:۔ اس کو آسیب چمٹا ہے۔ اس گھر میں ایک لمبی داڑھی والا بھوت ہے۔ میں نے راتوں کو اسے صحن میں ٹہلتے دیکھا بھی ہے —— چند ہی دنوں میں ہم یہ گھر بدل دیں گے"۔

میں اس کی باتوں کو ادھورا چھوڑ کر چلا آیا۔ مجھے اس بڑھیا پر رحم آرہا تھا بیچاری گھر بدلنے والی ہے۔ مگر وہ جس گھر میں بھی جائے گی وہاں وہ لمبی داڑھی والا بھوت بھی پہنچ جائے گا۔ ہندوستان میں لڑکی کبھی کنواری نہیں بیٹھ سکتی —— شوہر نہیں ہو گا تو بھوت مسلط ہو جائے گا ——

گھر پہنچ کر میں نے یہ واقعہ ظفر اور نوح کو سنایا۔ انہوں نے بھی بہت ہو کر سنا۔ اور پھر دوا لانے کی سبیل سوچنے لگے۔ اب رات کے نو بجے کون ڈاکٹر ہوگا جو ہم جیسے مفلسوں کو دوائی دے گا۔ ظفر نے سگریٹ سلگانے کے لیے دیا سلائی جلائی تو اس اجالے میں میری چھوٹی انگلی میں وہ پیتل کی انگوٹھی چمکی جو فاطمہ نے گاؤں سے چلتے وقت میرے دل میں اپنے آپ کو ہمیشہ زندہ رکھنے کے لیے پہنائی تھی۔ میں ظفر اور نوح سے کچھ کہے بغیر باہر نکلا اور ایک مشہور ڈاکٹر کے گھر گیا۔ اس کو گہری نیند سے جگایا۔ پہلے ایک تلخ باغیانہ لہجے میں اس لڑکی کی چھبیس سال سے رکی ٹھہری جوانی پر ایک تقریر کر ڈالی اور پھر انگلی سے پیتل کی انگوٹھی نکالنا ہی چاہتا تھا کہ ڈاکٹر کو جیسے میرے رستے ہوئے چہرے پھٹی ہوئی اچکن مگر آنکھوں سے جھانکتے ہوئے طنز کو دیکھ کر رحم آ گیا اور اس نے بغیر پیسوں کے ہی مجھے دوا دیدی۔
اس کے بعد میں اس لڑکی کے گھر جتنا تیز گیا ہوں اس کے اندازے کے لیے یہ سمجھ لیجیے کہ ایک جگہ سڑک پر بغیر ٹھوکر ہی کے گر پڑا تھا۔
نہ جانے اس لڑکی کو دوا پینے سے سکون آیا یا اس کے جسم کے شعلے خود بخود تھک کر بیٹھ گئے تھے۔ بہرحال وہ پھر آرام سے سو گئی۔
گھر واپس ہو کر جب بستر پر گرا تو بڑی دیر تک فاطمہ آنکھوں کے سامنے چمکتی رہی۔ میرے ہر خواب میں وہ مجھ سے پوچھتی تھی ——— میں نے کیا قصور کیا ہے ——— مجھے دوائی کیوں نہیں لا دیتے ——— پھر وہ چیخنے لگتی۔ پڑوس کی بڑھیا بار بار میرے باپ سے کہتی ——— اس کو

آسیب ہوگیا ہے۔ مکان بدل دو۔ میں نے آسیب کو راتوں میں صحن میں ٹہلتے دیکھا بھی ہے۔

رات ساری یہی خواب دیکھتے کٹ گئی۔

صبح بستر سے اٹھا تو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جسم میں مطلق توانائی نہیں ہے، رات بھر کروٹیں بدلتے بدلتے عضو عضو تھک گیا تھا اور خواب دیکھتے دیکھتے دماغ تو جھل ہوگیا تھا ـــــــ نہاتے وقت پورے پون گھنٹے نل کی دھار کو بیچ تالو پر کھلا رکھا جس کی ٹھنڈک سے دماغ کا بوجھ ہلکا ہوتے ہوتے اتنا لطیف ہوگیا کہ ایک پر سکون کیفیت مجھ پر طاری ہوگئی۔ ظفر بازار سے ناشتہ لانے گیا ہوا تھا اور نوح شیشے کے ٹوٹے ہوئے گلاس پر حجامت کا بلیڈ تیز کر رہا تھا۔ نہاتے ہوئے اچانک میری نظر صحن کی دیوار کے سوراخ پر پڑی۔ کافی بڑا سوراخ تھا۔ اتنا بڑا کہ اس میں دو بڑے بڑے سیب بہ آسانی رکھے جا سکتے تھے ـــــــ

اس میں واقعی دو سیب رکھے تھے ـــــــ دو سیب جیسے سرخ گال اور بادام جیسی آنکھیں ـــــــ میں نے جھینپ کر الگنی پر سے وہ چادر کھینچ لی جو تولیہ پھٹ جانے کے بعد سے تولیئے کے طور پر استعمال کی جاتی تھی نہ جانے وہ سیب اور بادام کب سے وہاں رکھے تھے ـــــــ اور میں کیسے مضحکہ خیز طریقہ پر نہا تا رہا تھا۔ پانی کی دھار سے ایک ننھے بچے کے مانند ہی تو کھیل رہا تھا۔ جسم پونچھتے پونچھتے میں نے نوح سے کہہ دیا۔ نوح نے بھی دیکھا۔ اور جب ظفر آیا اور ظفر کو معلوم ہوا تو وہ اُن باداموں اور

سینوں کی طرف ٹکٹکی باندھے اسطرح دیکھتا رہا جیسے ان کے بغیر ناشتہ مکمل نہ ہوگا۔ میں نے اور نوح نے طے کیا کہ اس لڑکی کی شادی ظفر سے کرادی جائے۔ کیونکہ ظفر ہی تو اس کا محبوب تھا ــــ وہ لڑکی جب ہذیان بک رہی تھی تو اس نے یہہ بھی کہا تھا ــــ میرا پیارا کیسی زور زور کے ٹھٹے لگا رہا تھا ــــ" زور زور کے ٹھٹے تو ظفر ہی لگاتا تھا ــــ میری شادی ہو چکی تھی۔ نوح کی شادی اس کے والدین کے اختیار میں تھی۔ صرف ظفر ہی لنڈورا تھا ــــ اس کا دنیا میں کوئی نہیں۔ سوائے ایک بوڑھے دادا اور ایک چھوٹی کنواری بہن کے ــــ باقی سب قریبی رشتہ دار دھرتی کی چھاتی میں چھپ گئے تھے ــــ ظفر اگر اس لڑکی سے شادی کر لیتا تو نہ اس کے والدین معترض ہوتے اور نہ سماج آڑے آتی ــــ ظفر کی خود یہہ خواہش تھی کہ وہ ادھر جنوبی ہندوستان ہی میں کسی سانولی سلونی رسیلی عورت سے شادی کرے ــــ اگرچیکہ سارا ہندوستان بنگالی عورت پر جان دیتا ہے۔ لیکن ظفر کہتا ــــ بنگال میں عورت کہاں ــــ سب جادوگرنیاں ہوتی ہیں۔ میں تو ایک بے ضرر نسائیت چاہتا ہوں۔ ایسی بے ضرر نسائیت جو جنوبی ہندوستان کی چاہتی رنگ والی عورت کے موٹے موٹے ہونٹوں، نیمباز آنکھوں، بڑی بڑی چھاتیوں اور گداز کولھوں میں چھپی ہوئی ہے۔ شادی ایسی ہی عورتوں سے کرنی چاہیے اور محبت ان عورتوں سے جو اتنی نازک ہوں کہ مرد کی بانہوں کا وزن برداشت نہ کر سکیں ــــ ہر ایسے خط و خال والی عورت

کو دیکھ کر وہ پکار اُٹھتا ــــ" واللہ ــــ یہ عورت اجنتا کے غار سے نکل کر بھاگ آئی ہے ــــ"

اسی لیے شام کو ہم نے ظفر سے پوچھا ــــ

میاں ظفر ــــ ہم دونوں نے ملکر طے کیا ہے کہ اس لڑکی سے تمھاری شادی کے متعلق بات چیت کریں"۔

ظفر چونک اٹھا ــ اور کچی نمولیوں کے رس جیسی مسکراہٹ سے پوچھا ــــ

"آج شام کھانے کے پیسے ہیں جیب میں ــــ؟"

نوح بولا ــــ" ارے تم پیسوں کی فکر نہ کرو۔ میری نانی ابھی تک زندہ ہے ــ اور ابھی تک بوڑھوا ہے ــ میں اگر اس سے کہوں تو وہ میرے لیے اپنے گلے کا آخری جڑاؤ ہار بھی اُتار کر دے سکتی ہے"۔

میں نوح کے اس حوصلہ افزا جملے سے تصور ہی تصور میں فاطمہ کو دیکھتے ہوئے ایک بے ساختہ مسرت سے بول اُٹھا۔

"یارو ــــ مجھے تو کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہت جلد ہمارا درخشندہ مستقبل طلوع ہونے والا ہے ــــ

یہ گندہ ہوٹلوں کا کھانا کھاتے کھاتے اس بے راہ رو زندگی کو گزارتے طبیعت تھک گئی ہے۔ظفر تم شادی کر لو۔ میں بھی اپنی بیوی کو لے آؤں گا۔ ہمارے چہروں کی کھوئی ہوئی

شگفتگی بہت جلد لوٹ آئے گی "۔

ظفر بھی خوش ہوگیا " اور میں اپنی چھوٹی بہن کو جواب جوان ہوگئی ہوگی۔ بنگال سے یہیں لے آؤں گا ——— ان دنوں ہم بہت جی لگا کر محنت کریں گے ——— یہہ کمرہ جو خالی پڑا ہے۔ اس کو صرف چاندی کے سکوں سے بھر دینگے "۔

نوح نے مسکراتے ہوئے کہا " نوشہ شیخ چلی ——— یہہ کمرہ تو تمھارا بڈروم ہوگا ——— بڈروم کو سونے اور چاندی کے سکوں سے بھر دینا رجعت پسندی ہے "۔

میں نے اس بیساختہ مسرت سے پیدا شدہ مضحکہ خیز گفتگو کو بدلنے کیلئے کہا۔

" دیکھو ظفر ——— اب تم ایک شرمیلے دولھا کی طرح پلنگ ——— پر بیٹھ جاؤ۔ کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کرنا۔ جو ایک باتمیز اور باحیا دولھا کی شان کے خلاف ہو ——— ہم تمھاری شادی کا پیغام لیے جا رہے ہیں "۔

میں نے اور نوح نے اپنی یونیورسٹی یونیفارم کی کالی شیروانیوں کو خوب رگڑ رگڑ کر برش کیا۔ کپڑے کی تھیلیوں میں عرصہ کی رکھی ہوئی ٹوپیاں صاف کر کے اوڑھیں۔ اور بار بار آئینہ میں منہ دیکھ کر ظفر کو چھیڑتے ہوئے باہر نکل گئے۔

داڑھی کی چھاؤں

اس بوڑھے سے تین گھنٹے تک جھک جھک بک بک کر کے جب ہم گھر لوٹے تو دیکھا کہ ظفر سچ مچ ایک باتمیز و باحیا دولہا کی طرح سر جھکائے پلنگ پر بیٹھا تھا ـــــــ ہمیں ہنسی آ گئی۔ نوح نے ڈانٹتے ہوئے کہا ــــ "پلنگ سے اتر منحوس! ـــــ کیا تو سمجھتا ہے کہ کسی مفلس کی پسلی سے کوئی حوا پیدا ہو سکتی ہے ـــ؟

ظفر کھسیانا ہو گیا اور بوکھلا کر پوچھنے لگا ـــــ
"صاف صاف کہو ـــــ کیا بات ہوئی ـ؟"

نوح نے شیروانی اتار کر کھونٹی پر لگاتے ہوئے گنگنانا شروع کیا ـ

یہ بازو یہ بازو کی تیری صلابت
یہ سینہ یہ گردن یہ قوت یہ صحت
یہ جوش جوانی یہ طوفان جرأت
یہ ایں وصف کچھ بھی نہیں تیری قیمت

تہیدست و محروم و نادار ہے تو ـ بڑا دکھ ہے مجھ کو کہ بیکار ہے تو

میں نے ظفر کے چہرے پر چھائی ہوئی مایوسی کو مٹانے کے لیے تسلی دی ـ

چھوڑ یار ــــــ ایک نہیں ہزاروں سارا جہاں حسین ہے۔"

"ظفر ایک ضدی بچہ کی طرح مچلا۔ نہیں۔ میں تو اسی لڑکی سے شادی کروں گا"۔

نوح بولا ــــــ "وہ لڑکی تو اس بوڑھے کھوسٹ سے بیاہی جا چکی ہے۔ جو روز رات کو اس کے صحن میں ٹہلا کرتا ہے۔"

مجھے اس لڑکی کے باپ پر ترس آ رہا تھا۔"یار ــــــ مجھے تو اس بوڑھے پر ترس آتا ہے۔ اپنی لاڈلی کی شادی طے کی بھی تو اپنے ہی جیسے کھوسٹ لمبی داڑھی والے سے۔"

نوح بظاہر اس بوڑھے کی طرفداری میں بولا۔ لمبی داڑھی ہوئی تو کیا ہوا۔ کماتا کھاتا تو ہے۔ شوہر کو صرف آتش فرو انجن تو نہیں ہونا چاہیے زندہ رہنے کے لیے روٹیوں اور ساریوں کی بھی تو ضرورت ہے۔"

میرے دماغ میں بے جوڑ شادیوں پر پڑھے ہوئے سارے افسانے ناچنے لگے اور میں رقت بھرے لہجے میں بولا۔

واہ رے دیس ــــــ ایک داڑھی کی چھاؤں سے دوسری داڑھی کی چھاؤں ــــــ جانے کتنی کنواریاں داڑھیوں کی اس گھنیری چھاؤں میں گھٹ گھٹ کر مر گئی ہیں"۔

نوح آج بات بات پر اشعار گنگنا رہا تھا۔

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو۔

ہٹاؤ یہ خرافات ــــ آؤ ہم سب مل کر اپنا پارٹی ترانہ گائیں ــــ

چور بازار

میں اور ظفر چپ چاپ سگرٹیں پیتے آسمان کو دیکھ رہے تھے۔ نوح اکیلا ہی گانے لگا۔

حیات و عمل کے گنہگار ہیں ہم — بڑا دکھ ہے ہم کو کہ بیکار ہیں ہم

یہہ گیتی ہے جس میں دفینے مکیں ہیں
وہ دریا ہے جس میں گہر تہہ نشیں ہیں
وہ جنگل ہیں جو رشک خلد بریں ہیں
یہہ فطرت کے انعام اپنے نہیں ہیں

تہیدست و محروم و نادار ہیں ہم — بڑا دکھ ہے ہم کو کہ بیکار ہیں ہم

جو موقع ملے سر فلک کا جھکا دیں
زمیں پر ستاروں کی شمعیں جلا دیں
خذف کو دمک دے کے سورج بنا دیں
ترقی کو کچھ اور آگے بڑھا دیں

کہ چالاک و ہشیار و بیدار ہیں ہم — بڑا دکھ ہے ہم کو کہ بیکار ہیں ہم

کہاں زر پرستی کہاں قدردانی
کہاں لوٹ و غارت کہاں مہربانی
یہہ بے آب ہستی یہہ بھوکی جوانی
یہ یخ بستہ بجلی یہہ استادہ پانی

بڑا دکھ ہے ہم کو کہ بیکار ہیں ہم

کہاں تک یہہ بالجبر مر مر کے جینا
بدلنے لگا ہے عمل کا قرینہ

لہو میں ہے کھولن جبیں پر پسینہ
دھڑکتی ہیں نبضیں سلگتا ہے سینہ
گرج اے بغاوت کہ تیار ہیں ہم بڑا دکھ ہے ہم کو کہ بیکار ہیں ہم
(کیفی اعظمی)

دو گھنٹے بعد میں اور نوح نوکری کی تلاش میں باہر نکلے اور سرِشام تھکے ہارے گھر پہنچے تو دیکھا کہ دالان کی سیڑھیوں پر ظفر بیٹھا ہوا دالان کی دیوار کے سوراخ کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا ہے۔ ہم دبے دبے قدم اس کے قریب گئے۔ اس کو ہماری آمد کا پتہ ہی نہ چلا۔ نوح نے قریب جا کر اس کے کان میں زور سے "ہاؤ" کیا ـــ ظفر اچھل پڑا اور پھر میرے سینے سے چمٹ کر بشاش لہجے میں بولا۔

"بھیا ـــــــ وہ سوراخ دیکھ رہے ہو۔ وہ کتنا چھوٹا سا ہے۔ صرف ایک سیب کے برابر ـــ مگر میری پیٹھ تھپکو۔ مجھے مُبارک باد دو کہ میں نے اس سوراخ سے ایک سرو قد نوجوان لڑکی کو کھینچ کر نکالا ہے۔

نوح نے اس کے گال پر محبت کا طمانچہ لگاتے ہوئے کہا۔

"پاگل ـــــــ!"

ظفر اسی محویت میں بول رہا تھا "لمبی داڑھی کا گھنیرا سایہ ـــ چہرے پر لمبا گھونگٹ اور اطراف اونچی اونچی چار دیواری ـــ مگر ایک باہمت لڑکی کی راہِ فرار کے لیے ایک ننھا سا سُوراخ بھی کافی ہے۔"

نوح بولا ـــ کسی نے سچ کہا ہے۔ عشق را بہ عقل چہ کار ـــ ؟

ظفر کو غصہ آگیا "میں پورے ہوش و حواس میں ہوں نوح۔

اب اُس لڑکی کی کسی سے بھی شادی کر دو۔ اس نے مجھے اپنی روح دیدی ہے۔ یہاں میرے دل پر ہاتھ رکھو۔ میرے سینے میں کیا تمہیں دو دلوں کی دھڑکن صاف سنائی نہیں دیرہی ہے ـــــ اس نے میرے کانوں میں جیسے لوری دی ـــــ کہ میں تمہاری ہوں اور تمہاری ہی رہوں گی ـــــــ"

اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے وہ برابر بھرائے ہوئے لہجے میں بول رہا تھا

آج ہی سویرے میں نے ایک سندر خواب دیکھا کہ میری اس لڑکی سے شادی ہوگئی ہے اور میں کشمیر جانے والی لاری کے پہلے درجے میں اس کی کمر میں بازو حمائل کئے ہنی مون کے پروگرام سوچ رہا ہوں - - - - - - - -

میرے کانوں میں ظفر کی آواز پڑ رہی تھی مگر دماغ اس آواز سے دور ہی دور بھاگ رہا تھا ـــــ فاطمہ کے پاس ـــــ ۱۹۴۸ء کے بعد سے اس دیس میں خواب کی شادیاں بہت ہونے لگی ہے۔ ظفر جیسے کتنے کنوارے خواب میں شادی رچاتے ہیں اور بیداری میں اپنی دلہنوں کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ مجھے بھی کچھ کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میری شادی بھی خواب کی شادی ہی ہے۔ اگرچہ میں نے کھلی آنکھوں سے فاطمہ کا چہرہ دیکھا ہے۔ اپنی ہتھیلیوں سے اس کے جسم کا گداز اور لمس محسوس کیا ہے ـــــ لیکن اب سب کچھ خواب ہو گیا ہے۔

نوح اگر اس وقت ماچیس نہ مانگتا تو شاید میرے جسم سے نکلی ہوئی فاطمہ کے گرد منڈلانے والی روح واپس نہ آتی اور میں گوتم کے بت کی طرح ہمیشہ کے لیے ساکت ہو گیا ہوتا۔

چھیڑ خوباں سے .....

ایک صبح ناشتہ لانے کی میری ڈیوٹی تھی۔ ظفر اور نوح ابھی سو رہے تھے۔ میں بازار چلا گیا۔ نان بائی ایک پرانے انگریزی اخبار میں روٹیاں لپیٹ رہا تھا اچانک میری نظر اس اخبار کی تصویر پر پڑی ———

میرے منہ سے بے اختیار نکلا ———

" فاروق ——— !" ہماری ہوسٹل کا فوڈ مانیٹر فاروق تصویر میں ایک انگریز عورت کے ساتھ گرجا سے نکلتا دکھائی دے رہا تھا۔ تصویر کے نیچے لکھا تھا ——— فاروق حسین آئی۔ سی۔ ایس ویڈز برائیڈ مس لوسی گاربٹ

میں نے جلدی سے روٹیاں اخبار میں لپیٹ لیں اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گھر دوڑا ——— دونوں منحوس ابھی سو رہے تھے۔ میں نے دونوں کے کان پکڑ کر اٹھا دیا۔ اور وہ اخبار سامنے رکھ دیا دونوں چپ چاپ دیکھ رہے تھے۔

میں نے جھلا کر پوچھا ———

"کیا دیکھ رہے ہو ——— ؟"

ظفر بولا ——— زاغ کی چونچ میں انگور ——— خدا کی قدرت!

نوح نے نیچے کی خبر پڑھتے ہوئے کہا " یار ——— یہہ تو بہت بڑا آدمی ہو گیا ——— "

ظفر نے کہا ——" تمھارے نزدیک آدمی کی بڑائی کا معیار صرف یہی رہگیا ہے کہ وہ آئی۔سی۔یس ہوجائے۔ تمھارے ذہنی افلاس پر آنسو بہانے کو جی چاہتا ہے —— یاد کرو پرانے ہندوستان کے معمولی آدمی راجہ اور مہاراجہ بھی بن جاتے تھے۔ بلکہ ہمالیہ کی چوٹیوں پر بیٹھ کر آدمی سے مہاتما بھی بن جاتے تھے —— اور اب تو بڑائی صرف آئی۔سی۔یس پر آکر رک گئی ہے"

نوح نے چڑ کر کہا "یار تم نے صبح ہی صبح دماغ کھانا شروع کر دیا۔ پہلے تو تم ایسے نہ تھے۔ جب سے اس لڑکی نے تمھارے دماغ میں خلل پیدا کیا ہے بس ایسی ہی سٹری بسٹری باتیں کرنے لگے ہو۔ ارے خوش ہو جاؤ کہ ہمارے ہی ایک دوست کی زندگی پر کشتی دیوی مسکرا رہی ہیں وہ اسی شہر کا کلکٹر بن کے آیا ہے —— ہمارے بھی کبھی کام آجائے گا"

ظفر نے ایک لمبی سانس میں کہا "خواہ مخواہ اتنی ساری باتیں کہدیں۔ صرف آخری جملہ کہہ دیتے ——"

نوح نے ظفر کے جملے کا برا نہ مانا اور تصویر دیکھتے للچائی آواز میں بولا "یار —— بڑی خوبصورت پری اڑائی ہے اس نے"

ظفر ابھی تک چڑا ہوا تھا "ہاں —— یہی پری ایکدن اس کو خودکشی پر مجبور کر دے گی۔ اچھا پہلے منہ دھولیں ——"

ہم تینوں منہ دھوتے ہوئے باتیں کرنے لگے "تم ٹھیک کہتے ہو ظفر —— تم اس پارسی بیرسٹر کے لونڈے اسفندیار کو جانتے ہو نا —— بڑی شان سے ایک ٹینس کی چل پری اڑا لائے تھے لیکن تیسرے ہی سال جا کر دو

کا دیوالیہ اٹھا کر اب ایک چھوٹا سا شراب خانہ کھول لیا ہے ——— وہ ٹیمز کی پری پیر ٹیمز کے ساحلوں پر آفتابی غسل کے مزے اڑا رہی ہے"۔
ظفر نے بڑی سنجیدگی سے ہاں میں ہاں ملائی "ہاں بھئی ——— اور ادھر ہندوستانی لڑکیوں کو دیکھو۔ ایک ننھے سے سوراخ سے بھاگنے پر تلی ہیں ——— چار چار لڑکیاں ایک ہی مرد کے گلے میں بانہیں ڈالے ہوئے ہیں۔ لیکن پھر بھی عورتیں باہر سے چلی آ رہی ہیں۔ اگر بیرونی عورتوں کی درآمد کا یہی حال رہا تو مجھے اندیشہ ہے کہ تھوڑے ہی عرصہ بعد اس دیس میں کنواری عورتوں اور ہیبر یا کے سوائے کچھ بھی نہ ہوگا ———"
فاروق حسن کا گرویدہ نوح بولا "تم فاروق کی اس مصلحت اندیش سیاسی چال کو نہیں سمجھ سکتے۔ ہندوستانیوں اور انگریزوں کے لہو کے اس آمیزے سے وہ ایک ایسی نسل تیار کرنا چاہتا ہے جس سے کل غزنوی اور ایاز میں کوئی امتیاز نہ رہے گا"
ظفر نے نوح کو گالی دی "سالے چپ۔ اس میں کوئی سیاسی چال نہیں یہ نفس کی غلامی کے سوا کچھ بھی نہیں ——— ابھی جیسے تو فاروق کی بیوی کی خوبصورتی کی تعریف کر رہا تھا اسی طرح فاروق بھی اس عورت کی کسی دلنواز مسکراہٹ، کسی دلکش ادا، اور کسی طویل بوسے سے وارفتہ ہو گیا ——— عورت سامنے ہو تو سیاست کہاں یاد آتی ہے ——— مجھے تو کم از کم عورت کی آغوش میں آج تک کوئی سیاسی چال نہیں سوجھی ———"
ظفر کے اس عجیب و غریب استدلال پر جیسے میرا دل مسکرا دیا۔ میں نے

کہا ــــ" اچھا بھئی چلو ــــ ناشتہ کرلو پہلے ــ عورت کی باتیں ہمیشہ پیٹ بھرنے کے بعد کرنی چاہیں ــ"

نوح نے بستر سے اٹھتے ہوئے کہا "یار آج فاروق سے ملنے جائیں گے۔

ظفر نے کہا " وہ ہمیں نہیں پہچانے گا "

نوح تڑ سے بولا ۔" کیوں نہیں پہچانے گا ــ ؟ اگر نہیں پہچانے گا تو ہم اس کے کان نہیں اینٹھ دیں گے اور ہوسٹل کا وہ قصہ سنائیں گے ۔ جو

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ظفر نے نوح کو متنبہ کیا " اچھا اچھا سنا دینا ــــ مگر براہِ مہربانی آپ میری روٹی پہ ہاتھ نہ ڈالیے ۔ آپ کی روٹی وہ ہے "

ہم تینوں ہنس پڑے ۔ اور اس وقت ہم نے صحن کی دیوار کے سوراخ سے بھی ایک ہلکی سی ہنسی سنی ــــ بیوقوف لڑکی ! ــ

پھر یونیورسٹی یونیفارم کی شیروانیوں پہ برش چلنے لگے ۔ آئینہ میں بار بار منہ دیکھا جانے لگا ــــ آئی ۔ سی ۔ ایس سے ملنے جا رہے تھے !۔

فاروق حسین ہوسٹل میں نوح کا تین سال تک روم میٹ تھا ــــ اسی لیے نوح کے دل میں فاروق حسین سے کچھ ایسی توقعات تھیں کہ وہ فٹ پاتھ پر ہم سے دو دو قدم آگے نکلا جا رہا تھا ۔

راستے میں گرلز اسکول کی پھاٹک کے پاس ہمیں ایک لڑکی کھائی دی جس کو دیکھ کر یہہ کہنا پڑتا تھا کہ یہہ دوسری حوا ہے جو جنت سے نکال دی گئی ہے ۔ اس کا جسم جیسے اناروں سیبوں اور باداموں سے لدا ہوا تھا ۔ ہم سب اس کے قریب کھڑے ہو کر سگریٹ سلگانے لگے ۔ یہہ ہماری عادت تھی ۔ جب کبھی ہمیں

کوئی خوبصورت اکیلی لڑکی یا عورت مِل جاتی تو اپنے ذوقِ نظر کو تسکین دینے کے لیے ہم سگریٹ سلگانے کے بہانے کھڑے ہو جاتے تھے۔ وہ لڑکی بڑی بیباک نظروں سے ہمیں دیکھ رہی تھی۔ اِس کی کمر سے بھی نیچے لہراتی ہوئی چوٹی کو دیکھ کر ظفر سے نہ رہا گیا۔ اور گہری سانس لیتے ہوئے باآوازِ بلند بولا۔

"یہہ چوٹی کس لئے پیچھے پڑی ہے"۔

لڑکی نے سنا اور اپنی مسکراہٹ روک نہ سکی تو دوسری طرف منہ پھیر لیا ہم تینوں نے اس کی مسکراہٹ دیکھ لی۔ میں للچائی ہوئی آواز میں بولا ——

"یار —— اڑتی دکھے ہے"۔

میں نے اِس لڑکی کے گلے میں سونے کے ایک نازک ہار کو دیکھا۔ اور صلاح دی —— "یار کسی بورژوا کی معلوم ہوتی ہے۔ سر پر اولے نہ پڑیں کہیں —— !

ظفر کو نوح پر چوٹ کرنے کا موقعہ ملا"۔ اجی —— نوح صاحب کے جگری دوست یہاں کے کلکٹر بن کے آئے ہیں۔ آخر وہ کس دِن کام آئیں گے"۔

نوح نے چوٹ کا محسوس کی مگر ظفر پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا اسی لیے جواب دیا۔

"ہاں جی —— دیکھو میں اِس سے بات کرتا ہوں کیونکہ مسکرانے والی لڑکیاں بڑی باتونی ہوتی ہیں"۔

ظفر نے کہا —— "کیا اوٹ پٹانگ منطق ہے۔ بعض بعض اوقات تو یہہ ایسے جملے کہہ دیتا ہے جس کا نہ سر ہوتا ہے نہ پیر"۔

نوح اس لڑکی کے قریب گیا لیکن لڑکی گھبرا کر ایک دم سے پھاٹک کے

اندر غائب ہو گئی اور میں ہونٹوں کو اپنے دانتوں میں دبانے کے باوجود کھل کھلا کر ہنس پڑا۔

ظفر ذرا اونچی غصیلی آواز میں بولا ـــــ "تم سے کس نے کہا تھا کہ تم اس ہیت کذائی میں بھینسے کی طرح جھومتے ہوئے اس کے قریب جاؤ۔ پہلے اپنی شیروانی کے پھوسڑے نکلے ہوئے کالر کو تو یاد کر لیا ہوتا ـــــ گلے میں سونے کی زنجیر پہنے ہوئے لڑکیاں بھلا پھوسڑے نکلے ہوئے کالروں سے عشق کر سکتی ہیں؟ میرا تو خیال ہے کہ اس دیس کی آدھی سے زیادہ لڑکیاں اپنے شوہروں اور منگیتروں کے بجائے فلم ایکٹروں سے محبت کرتی ہیں۔ جب میں بمبئی گیا تھا تو ایک فلمی پرچے کے ایڈیٹر نے ایک ایکٹر سے دوستی کرائی تھی ـــــ میں نے اس ایکٹر کی ایک دن کی ڈاک دیکھی۔ کل ایک سو اٹھارہ خطوط تھے۔ جن میں سے ایک سو پانچ خطوط کنواری لڑکیوں اور بیاہتا عورتوں کے تھے اور باقی کالج کے لڑکوں، بے روزگار نوجوانوں، خیاطوں، پہلوانوں اور پنواڑیوں کے ـــــــــ

نوح نے اکتا کر کہا۔ "یار ـــــ اس لڑکی کی بات کرو ـــــ کہاں دنیا جہان کا بکھیڑا اٹھا رہے ہو۔"

ظفر نے میری کمر میں کہنی مارتے ہوئے کہا ـــــ لیجئے ـــــ آپ کو عشق ہو گیا ـــــ ارے یہ لڑکیاں تو طور کی تجلیاں ہیں۔ دیکھا بھی اور نہیں بھی دیکھا۔ وقت کو اچھا گزارنے کے لیے ذرا چھیڑ لیا۔ اور پھر اپنی راہ لگے ـــــ میں نے کئی ایسی لڑکیوں کو سڑکوں پر، باغوں میں، سینماؤں میں، دوکانوں میں،

ہوٹلوں میں چھیڑا ہے۔ پیچھا کیا ہے۔ مگر کسی کا بھی چہرہ مہرہ یاد نہیں۔ ارے
ان سے عشق لڑنا اور بھوتوں کی مشعل سے راستہ تلاش کرنا ایک ہی بات ہے
—— البتہ بعض وقت یہہ گرانبار زندگی بڑے لطف سے گزر جاتی ہے
اب یہی دیکھو۔ فاروق کا دفتر بھی آگیا اور راستہ معلوم ہی نہ ہوا۔ اس لڑکی
نے جیسے اپنے آپ کو ہم پر طاری کر کے اتنی لمبی مسافت کا خیال ہی دل
سے بھلا دیا۔ شائد قدرت نے اسی لیے زندگی کی دشوار گزار لمبی سڑک پر
ہر مرد کی پسلی سے ایک عورت چپکا دی ہے۔

نوح نے کہا "اچھا بابا —— اب یہہ لمبی بکواس ختم کرو۔ یہہ جب
بات کرتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے شیطان کی آنت کھول رہا ہے۔ اتنی
سی لڑکی پر اتنی لمبی تقریر کر دی۔

ظفر نے جواب دیا —— اگر میں ہندوستان سے باہر ہوتا تو ضرور ایک ہی
دو جملوں میں اس لڑکی کا قصیدہ پڑھ دیتا مگر یہہ ہندوستان ہے۔ یہاں وقت
کی بہت فراوانی ہے۔ اور یہاں کے لوگ بھی لمبی لمبی باتیں کرنے کے عادی
ہیں۔ گاندھی جی برسوں سے آزادی دیدو۔ آزادی دیدو۔ کے نعرے لگا رہے
ہیں —— جناح چہ رسال سے اوسطاً چار گھنٹے روز پاکستان اسکیم
پر تقریر اور گفتگو کرتے ہیں۔ لیکن کچھ بھی نہیں ہوتا اور ادھر روس میں لینن نے صرف
ایک آواز لگائی۔

"دنیا کے تمام مزدور متحد ہو جاؤ" تو بھی چٹ پٹ ایک سُرخ انقلاب ہو گیا
نوح واقعی گڑگڑایا —— یار۔ اب تیرے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں

چپ رہ ـــــ صرف تو ہی ہمہ داں نہیں۔ ہم بھی پڑھے لکھے ہیں۔ ہمارے سروں میں بھی بُدھی ہے۔ مگر تو بدھی کو نہ چاٹ پہلے ہی سے کتابوں نے اسے چاٹ رکھا ہے۔ ہاں۔ اگر فحش گندہ جنسی گالیاں اس کے عوض دے تو مجھے بُرا نہ لگے گا ظفر جیسے ناراض ہو کر چپ ہو گیا۔ فاروق حسین آئی سی ایس کا دفتر آ چکا تھا۔ ایک چٹھی تینوں درویشوں کا نام لکھ کر اندر اجلاس پر بھجوا دی۔ اور ایک لمبی بینچ پر بیٹھ کر فاروق حسین سے ملاقات ہونے پر گفتگو کرنے، کرسی پر بیٹھنے اور مسکرانے کے طریقے سوچنے لگے۔ کیونکہ ایک عرصہ سے مست سانڈوں جیسی بے تکلف زندگی گزارتے گزارتے ہم سارے مہذب طور طریقے، آداب و اخلاق بھول بھال گئے تھے۔ ایک خیال یہ بھی تھا کہ دریائے ٹیمز کی جل پری بھی اس کے ساتھ ہوگی۔ وہ کہیں ہمیں دیکھ کر ہندوستان کی شائستگی اور آداب و اخلاق کے متعلق کوئی غلط اندازہ نہ قایم کرلے۔

آئی ۔ سی ۔ ایس

دوپہرے سہ پہر ہو گئی جب فاروق حسین آئی۔ سی۔ ایس نے ہمیں اندر اجلاس پر بلایا۔ اندر داخل ہوتے ہی ظفر نے دبی دبی زبان میں کہا ـــــ

ہیلو سے جور میں لنگور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نوح صاحب تو فاروق کو دیکھ کر کھل گئے اور بڑی گرم جوشی اور بے تکلفی سے کہا ـــــ

"ہیلو فاروق ـــــ ہاؤ ڈو یو ڈو"

فاروق حسین نے مکھی اڑائی۔ مگر میں نے دیکھا ہے اس وقت اس کے چہرے پر کوئی مکھی تو نہیں بیٹھی تھی۔ میں اور ظفر بھی بے تکلف ہونا چاہتے تھے

مگر فاروق کے مکھی اڑانے کی اس حرکت نے ہمیں مرعوب کر دیا اور ہم خاموش ہی رہے ـــــ البتہ نوح صاحب بڑے خلوص سے کھکھیاتے ہوئے مسکراتے ہوئے اس کو یونیورسٹی کی بھولی بسری باتیں یاد دلا رہے تھے۔ فاروق اس کی باتوں پر مسکرا رہا تھا۔ مگر آئی۔ سی۔ ایس ہونے کے بعد سے اس کو مکھیاں اڑانے کی بہت بری عادت پڑ گئی تھی۔ نوح کو بھی شاید اس کی عادت کا احساس ہو گیا تھا اسی لیے اس نے بڑی عقلمندی سے اس پر طنز کیا۔

یار اپنی بیوی سے انٹروڈیوس تو کراؤ۔ ذرا انہیں وہ ٹیکسچر کی اکیڈوٹی[1] ـــــ سنا دیں جس کی وجہ سے تم نے ہوسٹل ہلا دیا تھا۔

ظفر نے موقع سے فائدہ اٹھا کر اردو میں کہا "طلاق ہو جائے گی یار ـــــ!

فاروق اپنی دکھتی ہوئی رگ دبتی دیکھ کر بڑی عقلمندی سے ہنس پڑا مگر اس ہنسی میں تھوڑی سی کونین بھی ملا دی " چپ رہو ـــــ فولس ـــــ

اس نے دانستہ طور پر اپنی بیوی کے سامنے ہمیں ذلیل کرنے کے لیے "فولس" کہا۔ ظفر بدلہ لینا ہی چاہتا تھا کہ نوح نے اپنی کمزوری فاروق سے بیان کر دی۔ " یار ـــــ تم تو اب یہاں کے کلکٹر ہو ہی گئے ہو۔ ذرا ہمارا بھی خیال رکھنا۔"

ظفر عمداً کھانستا ہوا باہر نکل گیا۔ میں نے اور نوح نے بلکہ فاروق نے

---

[1] ٹیکسچر کی اکیڈوٹی کیا ہوتی ہے غالباً ہر وہ شخص جانتا ہے جو کسی یونیورسٹی میں پڑھ چکا ہو۔ اگر آپ نہ جانتے ہوں تو بہت ہی اچھا ہے ورنہ آپ کو گھن آئے گی۔

بھی ظفر کے نوید پہچان لیے ـــــــــ

فاروق نے نوح سے وعدہ کر لیا اور ہم باہر نکل آئے۔ ظفر اگرچہ مسخرا تھا، کھلنڈرا تھا۔ لاابالی تھا۔ اور ہمیشہ غیر سنجیدہ رہتا تھا لیکن آصف الدولہ کے وزیر اعظم کا لہو اب بھی اس کی رگوں میں موجود تھا۔ اس کا محبوب شاعر اقبال اب بھی اس کی روح میں نغمہ زن تھا۔ اس نے خلاف توقع نوح کو نہ ڈانٹا اور نہ کچھ کہا۔ اور اس کے چہرے سے غصے کے آثار ظاہر ہوتے تھے مگر آج اس کا چہرہ کسی خاص دکھ سے کچھ پژمردہ سا نظر آرہا تھا۔ یوں تو ظفر میں اسی دن سے یہ تبدیلی یہ سنجیدگی پیدا ہو گئی تھی جب سے کہ ہمسایہ لڑکی چیخیں مارتی ہوئی صحن کی دیوار کے سوراخ سے نکل کر ظفر کے خوابوں میں چھپ گئی تھی لیکن آج تو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اب وہ نہ صرف منہ پھٹ نہیں رہا ہے بلکہ گم سم ہو گیا ہے ـــــ کسی شدید مایوسی نے اسے بالکل ہی قنوطی بنا دیا تھا!

راستہ بھر ہم چپ چاپ چلتے رہے۔ اور کچھ ایسا محسوس کرتے رہے جیسے ایک دوسرے سے ناراض ہو گئے ہیں لیکن گھر پہنچتے ہی دروازے پر ڈاکیے کی صورت دیکھتے ہی حیرت کی بات کہ ظفر خود ہی پہلے چیخ پڑا۔

یو آر این ایجل پوسٹ مین - - - - - - - -

چالیس روپے ـــــ! ڈاکیے کے چلے جانے کے بعد چالیس روپوں کا ننھا سپید چمکیلا ڈھیر بیچ میں رکھ کر ہم تینوں اطراف بیٹھ گئے۔ پہلے نوح کے والد کی عمر و اقبال کی سلامتی کی دعائیں مانگی گئیں! اور پھر تنے رزولیوشن

اور تجویزیں پیش ہونے لگیں ۔

"آج بریانی کھائی جائے گی"۔

"نہیں بریانی کئی بار کھا چکے ہیں ۔ پکچر دیکھا جائے"۔

"نہیں پکچر بھی نہیں ۔ کوئی نیا انوکھا مشغلہ سوچو جس میں رومانس بھی ہو اور جدت بھی ——"

"تو پھر چلو کسی طوائف کا گانا سنیں"۔

"ہاں ۔ یہ ٹھیک ہے —— ہم نے روتی ہوئی عورتیں تو بہت دیکھی ہیں مسکراتی ہوئی گاتی ہوئی عورتیں بہت کم دیکھی ہیں ——"

ظفر نے کہا —— نہیں بھائی —— آج تو ہمیں بریانی کھلا دو آج رات اس لڑکی سے میں نے اپنا اور اس کا مستقبل متعین کرنے کے لیے وقت مقرر کر لیا ہے ۔ آج شب وعدہ ہے ۔ میں تم لوگوں کو پہلے ہی گھر سے بڑھا دینے کی سوچ رہا تھا ۔ شکریہ محبت کے دیوتا کا ۔ اس نے خود ہی یہ موقع بتا دیا"۔

نوح کو ظفر سے صلح کرنے کا یہ بہت اچھا موقعہ ہاتھ آ گیا تھا ۔ اس نے کہا ۔ "ہم تمھیں بریانی کے ساتھ کوئی میٹھا بھی کھلائیں گے —— تمھاری خاص ڈش —— فروٹ سلاد بھی ۔ مگر ایک شرط پر کہ تم میری اس حماقت کو معاف کر دو ۔ جو فاروق حسین کی بیوی کی سپید چمڑی سے مرعوب ہو کر مجھ سے سرزد ہوئی"۔

ظفر نے کہا —— آؤ گلے مل لیں —— تاکہ کچھ دیر میرا اور تمھارا دل ایک ساتھ دھڑکتا رہے ۔ اس سے بہتر صلح کا اور کیا طریقہ

ہو سکتا ہے ــــــــــ؟"

میں نے ظفر کی ذہانت کی داد دی "بھئی ـــ دلوں کی ہم آہنگی کے لیے کیا ہی نرالا اور مجرب نسخہ بتایا ہے۔"

ظفر اور نوح گلے مل رہے تھے مگر کچھ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ سب کچھ ڈھونگ ہے۔ اس معانقہ میں دلوں کی ہم آہنگی سے زیادہ صرف گلے ملنے کا تخیل کارفرما ہے۔

سوناگاچی

رات ہم نے بریانی کھائی اور فروٹ سلاڈ بھی —— اور ہوٹل سے
باہر نکل کر ظفر کو خدا کامیاب کرے "وش یو لک" کہتے ہوئے میں اور نوح دھرتی
کے اس خطے کی طرف بڑھنے لگے جہاں گھنگروؤں کی آواز سازوں کے نغمے
اور عورت کی ادائیں ہندوستان کے فنون لطیفہ ابھی زندہ ہیں۔ ہندوستان
کی بھوکی اور ننگی عورتوں میں جو نسائیت مر رہی تھی۔ طوائف نے اس کو موت
کے منہ سے بچا کر اپنی ابروؤں، اپنی آنکھوں، اپنی رخساروں، اپنی کمر، اپنی
چھاتیوں، اپنی باہوں، اپنی پنڈلیوں اور اپنے ٹخنوں میں سمو کر اس کو
حیات جاوداں بخشی ہے۔

یہ بھی ایک بازار ہے لیکن نہ یہاں بھیک کی صدائیں سنائی دیتی ہیں،
نہ کسی کی آنکھوں میں آنسو چھلکتے ہیں۔ یہاں نہ کوئی موت سے ڈرتا ہے اور نہ
کسی کو زندگی کا کوئی خدشہ ہے۔ طوائف کے آگے نہ ہٹلر کی چلتی ہے نہ چرچل کی۔

"بھئی واہ۔ کیسی خوشبو کی لپٹیں آ رہی ہیں!"

نوح نے للچاتے ہوئے کہا "میں نے ہندوستان کے تمام بڑے بڑے
باغ شالامار سے لیکر کمپنی باغ سبھی دیکھ ڈالے لیکن ایسی روح افزا

خوشبو کہیں نہیں سونگھی۔ پھولوں کی خوشبو میں عورتوں کی خوشبو کی جو ہلکی ہلکی لپیٹیں آ رہی ہیں ——
آہ —— ہاؤ اسٹی سولینٹ، ہاؤ انسپائیرنگ ہاؤ اِن ٹالرزی کیٹنگ!"
ایک غنڈہ جو ہمارے پیچھے ہی پیچھے چل رہا تھا۔ شاید اس نے ہماری آواز سن لی اور قریب آکر کہنے لگا ——" ارے صاب —— میرے ساتھ آیئے۔ میں دکھاؤں آپ کو —— پھولوں سے بھی زیادہ خوشبودار عورتیں ——
اور غنڈہ لپکا —— پھر دوسرا۔ پھر تیسرا اس طرح ایک دم سات غنڈوں نے ہمیں گھیر لیا۔" صاب میرے ہمراہ چلئے میں سارا ہندستان چھان کر کشمیر سے ایک ہرنی لایا ہوں ——" ارے جناب —— میں آپ کو بالکل پرائیوٹ لے چلوں گا۔ آپ تو جانتے ہی ہونگے کہ پرائیوٹ مال کیسا ہوتا ہے ——"
ایک بوڑھا جو خوبصورت جوانیوں میں رہکر اپنی سپید ہوتی ہوئی داڑھی کو بھی بھول گیا تھا۔ بولا " صاب —— میری سنیئے۔ میں کلکتے کی سونا گاچی آپ کو یہاں دکھا دوں۔ نئی آئی ہے۔ اور آج ہی کھلے ہوئے پھول کی طرح نئی تازہ اور شاداب ہے —— بنگال کا سارا جادو آواز میں بھر لیا ہے اس کے۔ گاتی ہے تو بقول استاد غالب ——
اک تیر وہ جگر میں ہے مارا کہ ہائے ہائے۔۔۔۔۔۔
نوح بولا " سونا گاچی —— دی انڈین پیراڈائس —— آہ —— چلو اسی کے ساتھ چلیں ——"

سانولی عنڈے اس کو گالیاں دینے لگے۔ اور وہ ہمارے آگے آگے چلنے لگا ___ اس احاطہ میں صرف چار طوائفیں تھیں اور آٹھ دلال ___ میں نے نوح سے پوچھا۔ بتاؤ۔ ہندوستان میں کلرک زیادہ ہیں۔ یا دلال ___؟

وہ مسخرا بوڑھا بیچ میں ٹپک پڑا ___ "کلرک تو بہت بعد کو پیدا ہوئے صاحب ___ دلال تو ہندوستان کے اتنے ہی قدیم باشندے ہیں جتنے دڑاوڑی۔۔۔۔"

نوح نے پوچھا ___ "یار بڑے میاں ___ تم تو پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہو"

بوڑھا بولا ___ "ہاں صاحب ___ آپ کی دعا سے لکھنو کے ایک کتاب خانے میں نوکر تھا تھوڑا بہت پڑھا لکھا بھی ہوں اور وہاں کتاب خانے میں ناولیں پڑھنے کو مفت مل جاتی تھیں اور پھر آپ جیسے باذاق لوگ بھی وہاں آجاتے تھے تو گفتگو سُن سُن کر بہت کچھ سیکھ لیتا تھا ___ اس نوکری کو چھوڑنے کا بڑا افسوس ہے لیکن کیا کروں۔ عورتیں کتابوں سے بہت زیادہ بکتی ہیں ___"

میں نے تعریف کی۔ "واہ واہ ___ بڑے ذہین معلوم ہوتے ہو۔"

بوڑھا اپنی ذہانت کی تعریف سن کر اور رعب ڈالنے لگا۔ "صاحب ___ ہمارا پیشہ بڑا تاریخی ہے۔ جانے کس کتاب میں پڑھا تھا کہ ہندوستان ایک بیسوا ہے۔ جس کو دڑاوڑیوں نے آریاؤں کو، آریاؤں نے

پٹھانوں کو، پٹھانوں نے مغلوں کو اور مغلوں نے انگریزوں کو بیچ دیا ―
یہہ سب دلال ―
نوح نے مسکراتے ہوئے اس سے کہا "میاں ― تم تو بڑے قابل ہو۔ دلالی کے بجائے کوئی اچھا پیشہ کرو ― اپنی مٹی کیوں خراب کر رہے ہو یہاں ؟"
بوڑھا فوراً بولا ― "اچھے سے اچھے پیشے میں بھی تو دلالی ہوتی ہے جی مگر عورتوں کی دلالی اچھی ہوتی ہے اس میں ہاتھ کالے نہیں ہوتے ؟"
نوح ~~ظفر~~ نے مذاق کیا۔ منہ تو کالا ہو جاتا ہے ―
بوڑھا بولا "وہ تو دراوڑیوں سے لیکر مجھ کمترین تک سب ہندستانیوں کا کالا ہے ―"
ہاں لیجئے ― یہہ رہا سوناگاچی کے سونے سے ڈھلی ہوئی سندری کا کوٹھا ― یہہ عورت پڑھی لکھی اور اچھے خاندان کی معلوم ہوتی ہے نہ جانے اس کی قسمت یہاں کیسے پھوٹی ―"
اس بوڑھے کے پیچھے پیچھے ہم کوٹھے پر چڑھ گئے۔ ایک چھوٹے سے کمرے میں بجلی کی تیز روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ایک سازندہ ستار کے تار ٹھیک کر رہا تھا ― ایک گدگدے گدیلے پر سپید چاندنی جیسی چادر بچھی ہوئی تھی۔ جس پر ایک بھرے بھرے جسم کی بوٹے سے قد کی لڑکی اوندھی لیٹی ہوئی ہتھیلیوں پر ٹھوڑی رکھے جیسے ماضی۔ حال یا مستقبل میں ڈوبی ہوئی تھی۔
بوڑھے کے بیگم جان کہہ کر کھنکھارنے پر وہ اٹھ بیٹھی۔ اور ہمیں دیکھ کر

اُٹھ کھڑی ہوئی ۔ اور مسکراہٹ کا جال ہونٹوں پر پھیلاتے ہوئے گردن میں ایک دل ہو لینے والا خم دیکر سلام کیا ——— میں نے اپنی پچھلی زندگی میں ان گنت خوبرو دلاویز عورتیں دیکھی ہیں لیکن یہہ تو چیزے دیگر" تھی ۔ اس عورت کے حُسن میں رنگ اور چمک کے علاوہ مقناطیسیت بھی تھی ——— ایسی عورت کو دیکھ کر انسان ایسا محسوس کرنے لگتا ہے جیسے اس کو رسے کی طرح اِدھر اور اُدھر کھینچا جا رہا ہے ——— اور یہہ عورت جیت جائے گی اور کشش ثقل ہار جائے گی ۔

چند لمحوں بعد سازندہ ستار کے تار چھیڑنے لگا اور طبلے پر تھاپ پڑی ۔ اور وہ اپنے سپید سپید ٹخنوں میں گھونگرو باندھنے لگی ۔ اسی اثنا میں ایک توندیل مارواڑی اندر داخل ہوا ہم دونوں کو دیکھ کر جھجکا اور پھر بلا تکلف مسکراتے ہوئے اندر داخل ہوا جیسے ہمارا بڑا پُرانا دوست ہے ——— ایک بیسوا کا کوٹھا ہی تو دھرتی پر ایک ایسا مقام ہے جہاں تعارف کی ضرورت نہیں ——— بغیر کچھ کہے سُنے سب ایک دوسرے کو پہچان لیتے ہیں ۔ چنانچہ جب میں نے نوح سے ایک سگریٹ مانگی تو سیٹھ جی نے اپنا سگریٹ کیس بڑی بے تکلفی سے میری ہی طرف بڑھا دیا ——— میں نے ایک سگریٹ سلگائی سیٹھ جی نے نوح کو بھی مجبور کیا ۔ نوح نے نہ جانے کیوں انکار کر دیا ۔ اسپر سیٹھ بولا ۔

یار ——— کیسے نوجوان ہو تم ——— جلاؤ ایک سگریٹ ———
ارے عورت کا ناچ دیکھنا ہو تو سگریٹ کے دھوئیں سے جھانک جھانک کر

دیکھو ــــــ زندگی کے دو ہی سہارے ہیں۔ سگریٹ اور عورت ــــــ
باقی سب دھوکا ہے دھوکا۔ مایا جال ــــــ"
نوح نے سیٹھ جی کو بناتے ہوئے کہا "ایک بورژوا کے منہ سے ایسی
باتیں ذرا عجیب معلوم ہوتی ہیں لیکن خیر ــــ اتنے بڑے کرہ ارض کا منہ
چڑانے والی توند کے باوجود بھی تم بڑے رنگیلے ہو ــــــ"
بیگم جان بھی لطف لینے لگی ـ" ہاں بابوجی ــــــ سیٹھ نے
جتنی دنیا دیکھی ہے۔ اس کو اپنی توند میں چھپا رکھا ہے "۔
سیٹھ جی لہرا گئے "واہ ڈارلنگ ــــــ بڑی فقرہ باز ہو تم ۔
یار ــــــ باپو کے زمانے میں جب میں اکسفرڈ یونیورسٹی میں
پڑھتا تھا تو ایک ایسی ہی فقرہ باز حسینہ تھی جس نے اپنی محبت میں مجھے
بالکل ہی کمیونسٹ بنا دیا تھا لیکن باپو کو پتہ چل گیا۔ اور انھوں نے بی ایس سی
کے فوراً بعد ہی اکسفرڈ سے واپس بلا لیا "۔
میں سیٹھ جی کی اس بڑھتی ہوئی بے تکلفی سے ذرا بے آرام سا ہونے لگا
اور سیٹھ جی کو بیگم جان کی طرف متوجہ کر دیا "
"دیکھئے تو ــــــ بیگم جان تیار ہو گئیں"
سیٹھ جی شاید تھوڑی سی چڑھا بھی آئے تھے۔ کچھ بہکے بہکے لہجے میں
کہنے لگے "ڈارلنگ بیگم جان ــــــ پہلے ناچو ــــــ پھر گاؤ یا پھر نہ ناچو
نہ گاؤ ــــــ چپ چاپ یہاں آ کر بیٹھ جاؤ اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دو۔
ــــــ اور دیکھو۔ میں نے تمھاری خواہش پوری کر دی ہے۔ تمھارے کہنے

سے میں نے تمہارے دیس بنگال کے بھوکوں کے لیے ایک دم دو ہزار روپے ریلیف فنڈ میں جمع کر دیئے۔ محض تمہارے حکم پر میری جان!

"میری بیگم ———— میری بیگم جان"

بیگم جان خوشی سے اچھل کر اس کے قریب گئی اور اس کے موٹے موٹے بلیڈر جیسے ہاتھوں سے اپنے گال سہلانے لگی ———— اور پھر باریک، نرم، میٹھی میٹھی آواز میں بولی ———— "سیٹھ جی ———— میں تمہاری ممنون ہوں۔ میں زندگی بھر تمہاری ممنون رہوں گی ———— میرے دیس کے قحط نے ہی مجھے کسی شریف گھر کی بہو کے بجائے بیسوا بنا دیا ———— اور نہ جانے کتنی میری ایسی لڑکیاں بیسوا بن جائیں ———— لیکن نہیں اب ایسا نہیں ہو سکتا ———— میرے راجہ سیٹھ نے دو ہزار روپے ریلیف فنڈ میں دے دیے ہیں۔ اب سوناگاچی کی بوڑھی طوائفیں جو دو دو روپے اور ایک ایک روپے میں ہم جیسی کنواریوں کو خرید خرید کر اپنے بڑھاپے کے مندے بازار کو پھر سے گرم کرنا چاہتی ہیں ———— ان مغرور بوڑھی مہارانیوں پر عذاب نازل ہو گا اب ———— ہاں۔

سیٹھ نے بلا تکلف کہہ دیا۔" اگر یہ پہلے معلوم ہو جاتا تو بھگوان قسم میں ایک پیسہ بھی ریلیف فنڈ میں نہ دیتا۔

بیگم جان نے سنا نہیں ———— وہ فرطِ مسرت سے بے اختیار ناچنے لگی تھی۔ اس کو نہ اپنی چولی دامن کا خیال تھا اور نہ ناف ٹل جانے کا ڈر۔ اس کی کاکلیں فصیلی ناگنوں کی طرح لہرا رہی تھیں۔ ناچتے ناچتے اس کے سرخ

گال تمتا رہے تھے بغلیں پسینے سے بھیگ گئی تھیں اس کا لہنگہ چھتری کی طرح پھیل گیا تھا۔ اور بلوریں پنڈلیاں نور کی کرنوں کی طرح زمین سے ٹکرا رہی تھیں۔
سیٹھ جی اپنی توند پر طبلہ بجاتے ہوئے بولے:۔
بھئی خوب ـــــ واہ ـــــ واہ واہ واہ ـــــ کمال کر دیا
بیگم جان نے ـــــ"
نوح نے کہا "سیٹھ ـــ بنگال رلیف فنڈ میں اور دو ہزار روپے دو بیگم جان اس سے بھی بڑا کمال کر دکھائے گی۔"
بیگم جان نوح کا یہ چبھتا ہوا جملہ سن کر ناچتے ناچتے ہوش میں آکر ٹھٹھک گئی ـــــ ایک لمحہ کے لیے نوح کو کچھ غصیلی اور کچھ نفرت آمیز نگاہوں سے دیکھا۔ پھر ہنس پڑی مصنوعی مگر کھنکھناتی ہوئی ہنسی جیسے کوئی قیمتی شراب صراحی سے پیالے میں انڈیل رہی ہو۔ اسکی اس حرکت سے صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ تعلیمیافتہ ہونے کے علاوہ بڑی قیافہ شناس عورت بھی ہے۔ اس کی سیاست میں گاہکوں کو ناراض کر دینا جیسے جرم تھا۔
سیٹھ جی بیگم جان کے اس اضطراب کو پہچان گئے اور بڑے متاثر ہو کر نوح سے بولے ـــــ "بھئی کیا اوٹ پٹانگ باتیں کرتے ہو تم ـــــ دیکھو بیگم جان آزردہ ہو رہی ہے ـــ اس کے چہرے کی لالی غائب ہو گئی ہے۔ اس کی پنڈلیاں سُست پڑ گئی ہیں۔ اس کے گھنگرو چپ ہو گئے ہیں۔"
نوح کو جیسے بیگم جان سے نفرت ہو گئی یا محض چڑ۔ "سیٹھ جی ـــــ بیگم جان کے چہرے کی لال کہیں نہیں گئی۔ اس نے وہ لالی قصداً چھپالی ہے۔

رنگ بدلنا تو اس کی فطرت ہے ـــــ ابھی دیکھئے ۔ چاندی کا ایک سکہ اس کی طرف پھینکتا ہوں وہ اپنے رخساروں میں پھر گلال بھر لے گی۔ اس کی پنڈلیوں میں ہرن کی چوکڑیاں سما جائیں گی۔ اس کے گھنگرو اتنی آواز سے جھنجھنا اٹھیں گے کہ سورگ کی اپسرائیں تک حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگیں گی ـــــ اتنی معمولی سی تاجرانہ بات تمھاری سمجھ میں نہیں آئی ـــــ جانے کیسے سیٹھ ہو تم۔

بیگم جان رنجیدہ ہو کر تھم گئی اور نوح کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

"میں یہ زہر نہیں برداشت کر سکتی ـــــ میں بھی انسان ہوں ـــــ"

نوح نے جھٹ سے جواب دیا۔ "نہیں تم صرف بیگم جان ہو"

سیٹھ بولا ـــــ "ارے یہ کیا ـــــ بھئی خاموش رہو یار تم۔ خواہ مخواہ اس کا ننھا سا دل دکھائے جا رہے ہو"

نوح آج جیسے حماقت پر اتر آیا تھا۔ "دل ـــــ ہونہہ ـــــ بیگم جان کے تو دل ہے ہی نہیں ـــــ"

سیٹھ جی ذرا چڑ گئے ـــــ "پھر اوٹ پٹانگ اڑانے لگے تم"

بیگم جان ایک بڑی مشق کے بعد سیکھا ہوا قہقہہ لگا کر بولی۔ "ہاں سیٹھ جی ـــــ یہ سچ کہتے ہیں۔ بیگم جان کے پہلو میں دل ہے ہی نہیں۔ اگر میرے دل ہوتا تو اس روز ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

آج اچھے سے اچھا حاضر جواب بھی نوح کے آگے شکست کھا جاتا۔

"اس روز کو یاد نہ کرو بیگم جان۔ وہ گزر گیا۔ طوائف کا ماضی نہیں ہوتا۔

بیگم جان جوش میں بولی "یہ ٹھیک ۔ طوائف کا کوئی مستقبل بھی نہیں ہوتا!
طوائف ہی وہ انسان ہے جو زمان و مکاں کی قید سے آزاد ہوتی ہے۔ طوائف
ہر رات ایک نئی دنیا بساتی ہے اور صبح اس کو مسمار کر دیتی ہے ۔ ہر لحظہ ہر لمحہ
ایک نیا پیکر اختیار کرتی ہے ـــــــ کل رات کی بیگم جان کچھ اور تھی آج
کی رات کچھ اور ـــــــ بیگم جان ہمیشہ ایک تغیر سے گزر رہی ہے ـــــــ"
نوح نے پھر بیگم جان کو ہرا دینا چاہا "بیگم جان بس۔ اب اپنے
تخیل کو زیادہ نہ پھیلاؤ ـــ بیگم جان تغیر سے نہیں گزر رہی ہے بلکہ ہماری
نظروں کے زاویئے بدل رہے ہیں۔"
سیٹھ جی نے پینترا بدل کر کہا "بھئی میں پاگل ہو جاؤں گا جانی ـــــــ
یہ باتیں سن سن کر تو میرا خون کا دباؤ بڑھ رہا ہے ـــــــ ارے گانا
سناؤ گانا! اپنے گلے کا رس میری روح کے خالی ساغر میں انڈیل دو ـــ
میں جینا چاہتا ہوں ـــــ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔"
بیگم سیٹھ جی کے اس اضطراب پر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ نوح کچھ کہنا چاہتا
تھا لیکن کوٹھے کی تنگ چھت سے ٹکرا کر اس کا قہقہہ کچھ اتنی دیر گونجا کہ نوح
کو کچھ نہ سوجھا ـــــــ نوح جیسے ہار گیا۔ مگر بیگم جان سے ایک لغزش ہو ہی گئی۔
اور نوح کو پھر سے سنبھلنے کا موقع مل گیا۔
بیگم جان ایک شریف بیاہتا عورت کی طرح سر پر دوپٹہ اوڑھ کر گانے لگی۔
میرا میکہ ہو یا سسرال مجھے دونوں طرف کا خیال
نوح نے ٹوک دیا "بیگم جان ـــــــ اس طرح سر پہ دوپٹہ اوڑھ کر تم

ہندوستانی عفت پر طنز کر رہی ہو ــــ اور پھر یہ میکہ اور سسرال کا خیال کیسے آ گیا تمھیں ــــ ؟ تم اپنے آپ کو بھول تو نہیں رہی ہو ؟"

بیگم جان تڑپ اٹھی اور گرجنے لگی "نہیں ــــ اب میں نہیں گاؤنگی نہیں ناچونگی ــــ آپ لوگ اب جا سکتے ہیں ــــ"

وہ غصیلی ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی دوسری کوٹھڑی میں چلی گئی مجھے بھی نوح کی اس بیہودگی پر بڑا غصہ آ گیا۔ میں اٹھ ہی رہا تھا کہ سیٹھ نے پکڑ کر بٹھا دیا ــــ "ارے بیٹھو یار ــــ میں اپنی ڈارلنگ کو ابھی منائے لاتا ہوں" ــــ

ادھر سیٹھ اندر کی کوٹھڑی میں چلا گیا ــــ اور ادھر دروازے سے ظفر اندر داخل ہوا اور کہنے لگا "کتنے کوٹھے چھان مارے یار ــــ مجھے کیا معلوم تھا کہ تمھیں سوناگاچی پسند ہے ــــ یار کبھی تم لوگ ہمارے دیس بنگال آؤ ــــ واللہ ایسی ایسی رنگ برنگی پریاں دکھاؤں کہ طبیعت پھڑک اٹھے ــــ آج کل تو جنگ اور قحط کی وجہ سے گھریلو شریف لڑکیاں بھی سوناگاچی میں جمع ہونے لگی ہیں ــــ ایک گھریلو لڑکی روپیہ سوا روپیہ میں بک رہی ہے میرے دوست" اور اس نے جیب سے سگریٹ نکالتے ہوئے پوچھا "یار ــــ مگر رونق محفل کہاں ہے ــــ ؟"

میں نے جواب دیا "روٹھ گئی تھی ہم پر واتاریوں سے ــــ ایک بوڑھا منانے گیا ہے ــــ آ جائے گی ابھی ــــ"

پھر گھونگروؤں کی آواز سنائی دی۔ بورژوائیت نسائیت کو مغلوب کر چکی تھی۔ دروازے سے پہلے سیٹھ جی مسکراتے باہر نکلے ــــ اور بولے ــــ "یار

پہلے وعدہ کرو کہ آئندہ فقرہ بازیاں نہیں ہونگی۔ بیگم جان اسی شرط پر آنے کے لیے تیار ہے۔

اس سے پہلے کہ نوح پھر کوئی بیہودگی کر بیٹھے میں نے کہہ دیا۔ "ہم وعدہ کرتے ہیں۔"

سیٹھ جی، بیگم جان کو یہ وعدہ سنا ہی چاہتے تھے کہ بیگم جان خود ہی باہر نکل آئی۔ لیکن اس کا چہرہ ابھی تک تمتمایا ہوا تھا جب وہ چھت کے بیچ میں لٹکتے ہوئے بجلی کے گولے کے قریب آئی ــــــ تو ظفر اچھل کر گاؤ تکیے سے الگ ہوا اور ایک اضطراری بے چینی سے آگے جھک کر بیگم جان کا چہرہ دیکھنے لگا۔ اور پھر ــــــ اور پھر ایک دم کھڑا ہو گیا۔ بیگم جان بھی ظفر کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ ظفر اس کے قریب گیا۔ اور اس کے دونوں شانے پکڑ کر اس کا چہرہ گھور کر دیکھنے لگا ــــــ بیگم جان اپنے موٹے موٹے دیدے تیز تیز گھماتے ہوئے اس کی دونوں آنکھوں کو یکے بعد دیگرے دیکھ رہی تھی ــــ ظفر کے گالوں پر دفعتاً آنسو بہہ نکلے لیکن ہونٹ مسکرا اٹھے۔ اور مسکراتے ہوئے اس نے بیگم جان کو پوری طاقت سے پیچھے گدیلے پر دھکیل دیا۔ اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ میں اور نوح گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے اور اس کے پیچھے بھاگے۔

باہر اندھیرا تھا ــــ گہرا سنسان خاموش اندھیرا ــــــ ظفر کہیں نہیں تھا جیسے وہ بھی رات کے اندھیرے اور سناٹے میں تحلیل ہو گیا تھا اور بیگم جان بھیانک آواز میں چیخ رہی تھی۔ "بھیا ــــــ ابھیا!!"

اور قریب ہی ایک ویران مسجد کا گنبد بیگم جان کو چڑا رہا تھا۔ "بھیّا ـــــ بھیّا ـــــ!!"

رات کے پچھلے پہر تک ہم ظفر کو ڈھونڈتے رہے۔ لیکن اندھیرے میں کھوئی ہوئی چیز کبھی ملی ہے۔ نوح کہہ رہا تھا ـــــ ظفر صبح اُجالا ہونے پر کہیں نہ کہیں مل جائے گا۔ مگر میرا دل کہہ رہا تھا کہ وہ اب اندھیرے اور اجالے کی حدود سے بھی دور نکل گیا ہے۔

شکستم

ڈراؤنے خواب

۔۔۔۔۔۔ جیسے تسبیح کا دھاگا ٹوٹ گیا تھا اور منکے بکھرتے جا رہے تھے ظفر کیا گیا نوح کے گھر کی قہقہوں سے گونجنے والی فضا ایک دم ساکت اور مبہوت ہو کر رہ گئی۔ اب دالان میں بیٹھے ہوئے میں یہ محسوس کر رہا تھا جیسے صرف خلاء میں بیٹھا ہوں اور در و دیوار کاٹ کھانے کو دوڑ رہے ہیں ہوا کے باہر سے آنے والے جھونکے صحن دالان اور کمروں میں سنسناتے ہوئے ظفر کو ڈھونڈ رہے تھے اور پوچھ رہے تھے بتاؤ ــــــ ہماری گود میں کھیلنے والے قہقہے ــــــ ہمارے بچے پر کیا گزرا، وہ کہاں بھاگ گیا ــــــ ؟" انہی ہواؤں میں ایک چیخ بھی ظفر کو تلاش کر رہی تھی ــــــ "دو بھتیا۔۔ ابھیا ــــــ !!"

میں کھسیانا ہو کر در و دیوار کو دیکھ رہا تھا۔ ہواؤں کی پر شور سنسناہٹ کو سن رہا تھا۔ مگر میں تو بے قصور ہوں۔ وہ آپ ہی آپ چلا گیا۔ ہم نے تو اس کو تاروں کی چھاؤں میں بھی ڈھونڈا۔ سورج کی روشنی میں بھی بہت تلاش کیا۔ مگر وہ الھڑ، ضدی، اتنی سی بات پر کہ اس کی بہن ناچ رہی ہے شاید ستاروں سے بھی آگے نکل گیا۔ میں نے اسی دیس میں سینکڑوں انسان ایسے بھی دیکھے ہیں جو خود اپنی کنواری بہنوں کے ٹخنوں میں گھونگرو باندھ کر بازار میں لے آئے۔

جب میں پہلی بار یونیورسٹی سے اپنے دیس کو جا رہا تھا۔ کیا ایک بوڑھے نے مجھ سے نہیں کہا تھا کہ میری لاڈلی بیلا بہت اچھی ہے؟ —— لاکھ درجہ اچھی —" اور کیا ظفر نے جو وہ قصہ میں نہیں سنایا تھا کہ وہ جب آدھی رات کو رجو بساطی کے گھر جاتا تو رجو اپنی بیوی کا پہلو اس کے لیے خالی کر کے حقہ پیتے ہوئے دروازے پر چوکسی کرتا —— ایسی ایک معمولی سی بات ہی تو ہے —— ہاں بالکل معمولی، غیر اہم، ناقابل ذکر! ——

" لوٹ آؤ ظفر —— تمہاری بہن عصمت فروش نہیں۔ وہ ویشیا نہیں بیسوا نہیں۔ کوئی اگر مجبور ہو کر اپنی عصمت بیچ دے تو اس کو عصمت فروش کون کہہ سکتا ہے۔؟ وہ ویشیا کیسے کہی جا سکتی ہے ——؟ دنیا میں ویشیا تو صرف ایک ہی ہے۔ اور وہ ہندر کی مالدار محبوبہ ہے —— لوٹ آؤ پیارے ظفر —— تمہاری بہن منظر عام پر ننگی کر دی گئی تو اس میں بیچاری بہن کا کیا قصور ——؟ برہنگی تو بڑا اعزاز ہے اس دیس میں —— خود ہمارے ہی دیس کے بھائیوں نے ایلورا اور اجنتا کے غاروں میں بڑی بڑی دیویوں اور مہارانیوں کو برہنہ کر دیا ہے —— تمہاری بہن تو صرف ایک نچلے طبقہ کی عورت ہے۔ اور نچلے طبقہ کی عورت تو ہر ایک کے آگے برہنہ ہونے کے لیے ہی پیدا ہوئی ہے —— بتاؤ۔ کیا تم اپنی بہن کے برہنہ جسم کو چھپانے کے لیے ایک ساڑھی بھی خرید سکتے ہو ——؟ پھر یہ رعب اور طنطنہ کس کو دکھاتے ہو —— لوٹ آؤ پیارے بھائی۔ بیوقوف نہ ہو۔ ہندوستان نے یہاں اپنا دار الخلافہ دیدیا۔ وہاں سونا گاچی بھی

اس کے قبضے میں نہ رہے ——— ؟ واہ تمہاری اور نہیں اگر سونا گاچی میں نہ رہیں تو سونا گاچی سونی نہ پڑ جائے گی ؟ ——— اور پھر کیا رہ جائیگا۔ ہندوستان میں ——— یہ گھنگرو نقلی سہی لیکن کیسی دلنواز جھنکار ہے۔ نہیں! یہ گانا بھرائے ہوئے گلے سے نکل رہا ہے مگر گانا تو ہے۔ ستار کے تار ٹوٹے ہوئے سہی ——— آواز تو دیتے ہیں ——— کیا یہ آوازیں ہندستان کی فتح کی غماز نہیں ——— ؟ سب کچھ ہار دینے کے بعد ہندوستان کا سونا گاچی میں محصور ہو جانا جیتنے والے جواری کو منہ چڑا رہا ہے کہ ہندوستان ہار نہیں سکتا ——— ہندوستان کبھی ہار نہیں سکتا۔"

میرے خیالات زہر میں بجھی ہوئی سوئیوں کی طرح میرے دل میں گھستے جا رہے تھے۔ میں تڑپ اٹھا اور اس سے لپٹ کر بے اختیار رونے لگا۔ دیوار کے سوراخ آنکھوں کی طرح ٹکٹکی لگائے آج پہلی بار ہماری آنکھوں میں آنسو دیکھ رہے تھے۔ اور ہوائیں ساکت و صامت ہمارے گریہ کی بھیانک آواز سن رہی تھیں ——— صحن کی دیوار کے سوراخ سے بھی ہم نے ایک ہلکی سی سسکی سنی۔ اور دیکھا جیسے آنکھوں کے بادام شبنم کے قطروں سے دھل رہے ہیں۔ نوح نے بمشکل حلق کے پھندے سے آواز نکالی ———

کیوں آنسو بہاتی ہو بہن! ——— تمہارا محبوب تمہیں چھوڑ کر چلا گیا اس کی بہن بازار میں ناچ رہی تھی ——— وہ بہت اچھا ناچتی ہے۔ بہت اچھا گاتی ہے۔ مگر تمہارے محبوب میں جمالیاتی حس نام کو نہیں۔ وہ عورت کو ناچتا ہوا دیکھ ہی نہیں سکتا۔ بدمذاق کہیں کا ———!"

وہ رات کتنی لمبی تھی ——— ؟ خالق کائنات نے قیامت کو قریب سے قریب تر کرنے کے لیے جیسے آنیوالی بہت سی راتوں کو اسی ایک رات میں جوڑ دیا تھا ——— کروٹیں، ٹھنڈی ٹھنڈی سانس اور اندھیرے میں سگرٹوں کے نھنے تانبا کے جگنو نیند کمبخت آتی ہی نہ تھی۔ ایسا ڈر محسوس ہو رہا تھا جیسے ہم اگر سو گئے تو کوئی بہت بڑا حادثہ ہو جائے گا ——— اسی لیے ہمیں سونا نہ چاہیے ——— میں نے تو فاطمہ کے فراق میں اتنی لمبی لمبی راتیں کاٹ دی ہیں لیکن یہہ رات تو خضر کی زندگی معلوم ہو رہی تھی۔

——— بالآخر غرفۂ صبح کھلا اور ہم ایک دوسرے کو صحیح و سالم دیکھ کر شام تک ایک دوسرے کو نہ جگانے کے لیے کہہ کر سو گئے ———

جاگنا بھی ایک مصیبت۔ سونا بھی ایک مصیبت۔ ادھر آنکھ لگی ہی تھی کہ میں پھر کوٹھے پر پہنچ گیا۔ اب وہاں ظفر کی بہن کے بجائے میری بیوی ناچ رہی تھی۔ بے باکی سے۔ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مسکرا مسکرا کر ——— میں ایک چیخ مار کر جاگ اٹھا۔

نوح نے کروٹ بدلتے ہوئے جاگ کر کہا "تم سوئے نہیں ڈوگے ——— میں بڑا عجیب خواب دیکھ رہا تھا۔ بیگم جان کے کوٹھے پر میری بوڑھی ماں چلی آئی تھی ——— میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ تم یہاں کیوں آئی ہو ——— ؟ مگر توبہ تمھاری چیخ ——— اجانے میری ماں وہاں کیوں آئی تھی ——— !

میرے دلبر ایک چوٹ سی لگی اور غضبناک آنکھوں سے آسمان کو دیکھتے ہوئے میں بڑبڑانے لگا " واقعی واہ ——— ماں بھی کوٹھے پر پہنچ گئی پناہ

لینے کے لیے کیا یہی ایک جگہ رہ گئی تھی ــــــ ظفر کی بہن، بہری بیوی، نوسا کی ماں ــــــ اے ماؤ، بہنو، بیبیو، دنیا کی عزت تم سے ہے۔ اے ماؤ بہنو، بیبیو، ....

نوح بھرا ہوا تھا۔ چیخ اٹھا "یہ کیا خرافات ہے ــــــ دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا" مگر تھوڑی دیر بعد وہ خود ہی کہنے لگا۔

اے ماؤ، بہنو، بیبیو دنیا کی عزت تم سے ہے۔ گاؤ ناچو ــــــ دنیا کی عزت تم سے ہے۔ آہا ہا کتنی فن کار ہوتی جا رہی ہیں ہمارے دیس کی عورتیں! گانا، ناچ ــــــ کون کہہ سکتا ہے کہ ہندوستان ایک روتا ہوا ملک ہے۔ ــ وہ تو سدا بشاش ہے۔ وہ تو اس وقت سے ہنس رہا ہے جبکہ دنیا کے دوسرے ممالک جانتے بھی نہ تھے کہ ہنسی کس کو کہتے ہیں ــــ؟ برطانیہ، امریکہ، روس جرمنی اور جاپان نے تو آج ہنسی سیکھی ہے۔ آج عروج کا منہ دیکھا ہے ــــ آج تمدن اور تہذیب سے روشناس ہوئے ہیں ــــــ مگر اے ہندوستان کی ماؤ، بہنوں، بیبیو، آفریں ہے تم پر ــ تم نے ناچ ناچ کر، گا گا کر اپنے بچوں کو بھوک سے بلکنے نہ دیا۔ اپنے بیمار شوہروں کے حلق میں دوائیاں ڈالتی رہیں۔ اپنے بیروزگار بھائیوں کو خودکشی سے باز رکھا۔ مفلسی اور غلامی میں بھی ان کے ہونٹوں کو مسکراہٹ عطا کی ــــــ اور یہ مسکراہٹ پلاسی کے فاتحین پر بھی چوٹ کرتی ہے کہ ہندوستان کبھی نہیں ہار سکتا ــــ ہندوستان کبھی نہیں ہار سکتا ــــــ!"

نوح نہ جانے اور کیا کیا بکتا رہا ــــــ میں اونگھنے لگا اور اونگھتے

اونگھتے شاید سو جاتا لیکن باہر سے تالی بجانے کی آواز نے پھر جگا دیا ——
پہلے موت کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔ اب جیسے نیند کو بھی ترس گئے ہیں ——
جاگتے ہیں تو بھوک بیروزگاری اور دنیا بھر کے تفکرات ستاتے ہیں۔ سوتے ہیں
تو مائیں بہنیں اور بیویاں خوابوں میں ناچنے لگتی ہیں۔
تالی کی آواز سن کر نوح مسکرانے لگا جاگ گیا ہے ہم سوچ رہا تھا لیکن نوح مسکرا رہا
ہے۔ اس کے ہونٹ دیکھو اس کی مسکراہٹ دیکھو جو پلاسی کے فاتحین کا مذاق
اڑا رہی ہے۔
وہ باہر گیا۔ فاروق حسین آئی۔ سی۔ یس کا چپراسی تھا جس کے
ہاتھ میں ایک خط تھا۔ نوح وہ خط پڑھ کر مجھ سے لپٹ گیا۔ ہنسنے لگا۔
قہقہے لگانے لگا —— اور میں حیران ہو کر اس کی صورت دیکھتا رہا۔

ٹیمز کی جل پری

نوح کو کلرکی مل گئی تھی۔ فاروق حسین نے اپنا حقِ دوستی ادا کیا
تھا۔ اور نوح اتنا مسرور تھا جیسے کلرکی کوئی نعمت غیر مترقبہ ہے ——
اب کتنی چھوٹی چھوٹی سی نعمتوں پر خوش ہونے لگے ہیں ہم ——!
نوح کا ذرا گوتم بدھ سے مقابلہ کرو جو اپنی وسیع و عریض راجدھانی سے خوش
نہ تھا اور برگد کے پیڑ تلے جا بیٹھا تھا —— زندگی کا اصلی لطف
تو ادھر ۱۸۵۷ء کے بعد سے آنے لگا ہے۔ لوگ بات بے بات خوش ہونے

بچے ہیں۔ کلرکی مل گئی تو نوح خوش ہوگیا۔ دو دفعہ کے بجائے تین دفعہ کھانا
مل گیا۔ اچھل پڑا —— زندہ رہو تو یوں ہنستے کھیلتے زندہ رہو ——
ناراض ہوکر برگد کے پیڑ تلے زندگی گزار دینے میں رجائیت کہاں —— ؟
کسی ہندوستانی کو خوش رکھنے کے لیے نہ ہالی وڈ کے مسخروں کی ضرورت
ہے اور نہ ناچ گھروں کی عورتیں چاہئیں۔ اس کو ہنسانے کے لیے نہ وڈہاؤس
کی کتابیں درکار ہیں اور نہ پنچ کے لطیفوں کی مدد چاہیے۔ اس کے سامنے
آپ بلاوجہ ہنس دیجیے وہ ہنس پڑے گا۔ منہ بسور کر دیکھیے پھر بھی وہ ہنس
دے گا۔ اس وقت میں متفکر پریشان خاموش، نوح کو دیکھ رہا تھا مگر نوح
مسکرا رہا تھا۔ ہندوستان کی روایتی تاریخی خوش باش زندگی کا ثبوت دے رہا تھا

اس دن موسم بڑا خوشگوار تھا۔ اتنے کالے کالے بادل آسمان پر
چھائے ہوئے تھے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بہشت کی تمام حوروں کی زلفیں
آسمان پر پھیل گئی ہیں۔ ہوائیں جیسے سپخانوں اور رستورانوں سے آرہی تھیں۔
اور دھوتی پر کچھ ایسا مدہم اجالا چھایا ہوا تھا جیسے فاطمہ کی کاکلوں کی
گھنیری چھاؤں میں اس کی گردن کی سپیدی۔ جی چاہ رہا تھا کہ کوئی
گناہ کریں یعنی ایسے موسم میں گناہ نہ کرنا سب سے بڑا گناہ تھا۔ آج
مفلسی کا روگ بھی نہیں تھا اور اس مہاجنی دور میں گناہ کے لیے صرف
چار آنے بھی کافی ہیں مگر ہماری جیب میں تو پانچ روپے تھے جو ایک اہیات
رومینٹک افسانے کے عوض ایک فلمی رسالے کے ایڈیٹر نے ہمیں عطا کیے تھے
نوح کو میں لاکھ لالچ دیتا رہا کہ چل —— جنگل کے کسی ٹیلے پر جا بیٹھیں

اور کسی بھٹکی ہوئی لڑکی یا عورت کو چاندی کے سکوں کی چمک سے اندھا کر کے اس سے کھیلتے رہیں جیسے بچے گڑیا سے کھیلتے ہیں! ور تھک کر اس کو توڑ دیتے ہیں۔ لیکن اب نوح کو اُودے بادلوں، نشیلی ہواؤں اور خوبصورت عورتوں سے کیا دلچسپی تھی۔ وہ تو اب کلرکی کی میز پر جھک گیا تھا۔ اس کی گردن تو اب ہمیشہ کے لیے جھک گئی تھی۔ ناچار میں اکیلا ہی باہر نکلا۔

مجھے اس وقت وہ عورت ـــــــ میرے گاوں کی عورت بیلا یاد آگئی۔ جس کے شوہر ـــــــ بوڑھے ناتھ نے اپنے سائبان میں رات گزارنے کے لیے آٹھ آنے کرایہ مانگا تھا۔ میری نظروں کے آگے اسکی پیاسی باتیں کرتی ہوئی آنکھیں گھومنے لگیں۔ اور میں اس کے تصور میں کھویا ہوا ریلوے روڈ پر چلنے لگا۔ بیلا ریلوے کوارٹرس میں رہتی تھی۔ جب میں وہاں پہنچا تو دروازہ بند تھا اسی لیے میں پلیٹ فارم کا جنگلہ پھلانگ کر پلیٹ فارم کے اندرونی حصے میں ٹہلنے لگا۔ ایک پورا چکر لگانے کے بعد جب سگریٹ سلگانے کے لیے کھڑا ہوا تو اچانک میری نظر پھر دروازے پر پڑی۔ جو آہستہ سے کھلا اور اسی لڑکی نے ادھر ادھر سڑک پر جھانک کر دیکھا اور پھر اندر ہو گئی۔ اس کے پیچھے سے ایک بد وضع بد قطع سہما سہما سا نوجوان لڑکا گھبراتا ہوا تیزی سے باہر نکلا اور سڑک پر پہنچ کر اطمینان سے آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ وہ بار بار مڑ کر پیچھے دیکھ رہا تھا۔ اور بیلا دروازے میں کھڑی تھی ـــــــ مطمئن، مسرور، مسکراتی ہوئی۔ مجھے جانے کیا سوجھی میں نے تیز تیز ڈگ بھر کر اس نوجوان کو جا لیا۔ اس کا شانہ پکڑ کر اسے ٹھہرا لیا ـــــــ اور مصنوعی

غصے سے گرجنے لگا۔

"آج ملے ہو حرام کار ـــــ بتاؤ تم کب سے اس گھر میں آتے ہو۔؟"

وہ نوجوان تھا۔ بزدل بھی نہیں معلوم ہوتا تھا لیکن گھبرا گیا۔ مُنہ میں
اچھی خاصی زبان رکھتے ہوئے بھی ہکلانے لگا۔

"بہ ۔۔۔۔۔۔ بابو جی ـــ ما ۔۔۔۔ مائیں تمھارے پاؤں
پڑتا ہوں ـــ مو ۔۔۔ مجھے ایک بار معاف کردو۔ بھئی ۔۔۔۔ پھر
کبھی نہیں آؤں گا۔"

میں اس کی سراسیمگی سے اپنا غصہ بھول کر ہنس پڑا اور اس نوجوان
کا لہجہ بھی بدل گیا ـــــ

اچھا تو بابو ـــــ تم یوں ہی دھونس گانٹھ رہے تھے۔

ہونہہ ـــــ ابھی وہ مجھ پر عاسک ہے۔ برابر جاتا ہوں۔ ابھی
جرور جاتا ہوں ہاں۔"

میں نے فوراً ہی اپنی غلطی محسوس کی مگر اس کو ہموار کرنا ضروری تھا کیونکہ
دروازے والا جنسی محبت کا ایک منظر دیکھنے کے بعد میرے لیے بادل اور بھی
اُودے ہو گئے تھے۔ ہوائیں اور بھی نشیلی ہو گئیں تھیں۔ میں نے کہہ دیا۔"

"یار ـــــ ہمیں بھی تو ملا دے اُس سے ــــ" وہ اکڑا ـــــ

"واہ صاب ــــ ذرا سوچ سمجھ کے بات کیجیے۔ آپ بڑے لوگ
غریب آدمیوں کی عزت و آبرو کو سمجھتے کیا ہیں ـــــ وہ میری معسوکا ہے
معسوکا ـــــ ایسا نہیں ہو سکتا۔"

میرے دل نے مجھ سے کہا۔ ارے سب کچھ ہو سکتا ہے تو اپنی جیب سے صرف ایک روپیہ نکال ــــــ پھر سب کچھ ہو سکتا ہے۔ میں نے روپیہ تو نہیں نکالا کیونکہ میں اپنے دل کی طرح بورژوا نہیں ہوں۔ صرف ایک چونی نکالی اور اس کی ہتیلی پر رکھ دی ــ وہ شرماسا گیا اور بولا۔ آداب صاب ــــــ صاب آپ چلے جائیے۔ وہ خود آپ کو بلا لے گی۔ ارے وہ تو سب کو بلاتی ہے صاب ــــ نقیا، مسو، راجو، خیراتی سبھی تو آتے جاتے ہیں اس کے پاس۔ بیچاری کا آدمی بہت بوڑھا ہے ــــــ یاں ریلوے میں پورٹر ہے ــــــ"

میں نے چونی کا ماتم کرتے ہوئے افسوس کے لہجے میں کہا ــــــ

"ارے تو پہلے کیوں نہ بتایا کمبخت ــــ"

مگر وہ بھی کیا کرے۔ راز چاہے چھوٹا ہو چاہے بڑا اپنی کچھ نہ کچھ قیمت رکھتا ہے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے میں راز کی قیمت سترہ ہزار روپے تھے اور آج چار آنے ہو گئی ہے ــــ وہ لڑکا تو مسکراتا ہوا چل دیا اور میں اس عورت کے گھر کی طرف مڑا لیکن میری قسمت میں تو جیسے صرف ایک ہی عورت لکھی ہے ــــ یعنی میری [illegible] ــ ــ ــ ــ ــ کیونکہ میں نے ایک نیلی وردی والے بوڑھے پورٹر کو [illegible] میں داخل ہوتے دیکھا اور میری نس نس میں رینگتی ہوئی چیونٹیاں یکایک [illegible] ۔ اور میرے پاؤں بغیر بھاگ دوڑ ہی تھک گئے۔ مجھے چار و ناچار [illegible] کر کے پلیٹ فارم پہ آنا پڑا ــ

اب پلیٹ فارم پر بہت سے لوگ جمع تھے۔ شاید کوئی ٹرین آنیوالی تھی۔ میں ٹہلتا ہوا ایک اسٹال پر گیا۔ اور انگریزی کا ایک عریان تصویروں والا رسالہ دیکھنے لگا۔ ایک تصویر میں ایک انگریز عورت سر سے پاؤں تک ننگی برف کے ایک گلیشیر پر کھڑی کھلی چمکدار، شوخ مسکراہٹ سے بھری آنکھوں سے دیکھ رہی تھی ــــ اس تصویر کے نیچے لکھا تھا ـــــــ ایک آرٹسٹک موڈ ــــــ مگر مجھے تو اس میں آرٹ وارٹ کچھ بھی نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ اس آرٹ نے تو میری رگوں میں تھمی ہوئی چیونٹیوں کو جیسے پھر دوڑا دیا تھا ـــــــ میں نے اِس سے بھی زیادہ برہنگی دیکھی ہے۔ ایلورہ اور اجنتا میں بے شمار برہنہ عورتوں کی تصویریں دیکھی ہیں لیکن اس برہنگی نے میرے جذبات میں کوئی ہیجان پیدا نہیں کیا۔ میں نے تو ایک تصویر اجنتا میں ایسی بھی دیکھی ہے جس میں ایک برہنہ مرد ایک برہنہ عورت کو اپنی آغوش میں لئے چمٹائے ہوئے تھا میں اس لذت ہم آغوشی کو بڑی دیر تک دیکھتا رہا۔ اور میری ریڑھ کی ہڈی میں ایک چیونٹی بھی نہ رینگی۔ وہ عورت برہنہ تھی مگر اس کی نیمباز، نیم وا آنکھیں بتا رہی تھیں کہ اس کو اپنی برہنگی کا احساس نہیں ہے۔ یا اگر احساس ہے تو صرف یہہ کہ وہ اپنے محبوب کے آغوش میں برہنہ ہے۔ کسی دوسرے کے نہیں۔ مگر یہہ انگریز عورت تو کھلی ہوئی آنکھوں سے شوخ مسکراہٹ سے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھ رہی تھی جیسے اس کو اپنی برہنگی کا پورا احساس ہے اور یہی احساس وہ اپنے دیکھنے والوں میں بھی پیدا کرانا چاہتی ہے ـــــــ اور اسی کو آرٹسٹک موڈ کہا جاتا۔

مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے انگریز عورت کی تصویر مجھ سے باتیں
کرنے لگی ہے۔ یعنی میرے دل میں چھپے ہوئے سوالوں اور شبہوں کا جواب
دے رہی ہے لیکن جب میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ فاروق حسین آئی سی ایس
کی فرنگن بیوی تھی جو اس کی بغل میں چپکی ہوئی باتیں کرتی بک اسٹال
کی طرف آرہی تھی۔ میں نے وہ رسالہ میز پر رکھ دیا اور وہاں سے ہٹ جانا
چاہتا تھا تاکہ فاروق حسین مجھے پہچان نہ لے ـــــ کیونکہ اگر پہچان لے
اور میری طرف دھیان نہ دے تو مجھے کوفت ہوگی۔ مگر فاروق خود ہی
میری طرف دیکھ کر مسکراتا ہوا بڑھا اور پوچھا۔

"اوہ ـــــ جلیل ـــــ ہاؤ ڈو یو ڈو۔"

میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اچھا ہی ہوا کہ وہ میرے جواب کا
انتظار کئے بغیر خود ہی بولنے لگا۔

"جلیل ـــــ مجھے مبارکباد دو۔ اب تو ہم باپ بن گئے ہیں۔
میں نے اس کی طرف خواہ مخواہ مشکوک نظروں سے دیکھا" باپ
ـــــ ؟ اوہ ـــــ مبارک ہو۔ مبارک ہو۔ کیا کہیں جا رہے ہو ـــــ ؟"
فاروق فرنگن کا ہاتھ اور مضبوطی سے اپنی بغل میں دباتے ہوئے بولا۔
"ہاں ـــــ یہ انگلستان جا رہی ہیں۔ تم تو جانتے ہی ہو۔ میں بھلا اپنے لڑکے
کی ایسے ڈرٹی ہندوستانی ماحول میں پرورش کیسے کر سکتا ہوں ـــــ
میری وائف کہتی ہے کہ اس ماحول میں انسان پیدا نہیں ہو سکتا۔"
میں نے اس فرنگن کی کانچ کی گولیوں جیسی آنکھوں کو طنزیہ نظروں سے

دیکھتے ہوئے کہا" ہاں۔ یہہ سچ کہتی ہیں۔ ہندوستانی اولاد کو انسان بنا چاہیے اور انگلستان ہی انسان سازی کا سب سے بڑا کارخانہ ہے۔"

فاروق حسین بولا "۔ واقعی بھئی ——— وہاں کی ایک معمولی سی ریستوران میں صرف چائے پینے کے لئے چلے جاؤ اور پھر باہر نکلو تو تم یقیناً اپنے آپ کو ایک نیا تہذیب یافتہ انسان محسوس کرو گے مگر یہاں بارہ برس ولی میں رہو پھر بھی بھاڑ ہی جھونکتے رہو گے۔

مجھے فاروق حسین کی باتوں سے وحشت ہونے لگی۔ میں اس سے اجازت لے کر وہاں سے ٹل جانا چاہتا تھا لیکن ایک نرس ایک روتے ہوئے ننھے بچے کو اٹھائے قریب آگئی اور فاروق حسین نے بڑھ کر بچے کو گود میں لے لیا اور پیار کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"دیکھ رہے ہو جلیل ——— ہاؤ بیوٹی فل ——"

میں نے کہا ——— ؟

"یس ویری نائیس کِڈ!"

میرا دل کہہ رہا تھا کہ یہہ فاروق حسین کا بچہ نہیں۔ اس میں فاروق کی شباہت نام کو بھی نہیں تھی۔ سرخ بال سرخ گال نیلی آنکھیں اور رونے کا انداز بھی ہندوستانی بچوں سے جداگانہ ———

اسی اثنا میں گاڑی آگئی اور فاروق نے گرمجوشی سے اپنی فرنگن کو سینے سے چمٹا کر اس کے ہونٹوں کا لپ اسٹک چوس لیا ——— اس کی آنکھوں میں ننھے ننھے سے آنسو بھی آگئے تھے۔ مگر وہ ہنس ہنس کر کہہ رہی تھی۔

ڈونٹ وری ڈارلنگ — آئی وُڈ بی
بیک جسٹ آفٹر فائیو ایرس —"

پانچ سال —— ! خوب خوب ! میرا دل اس فرنگن کی اس "جسٹ فائیو ایرس" والی تسکین کی داد دے رہا تھا۔ گاڑی ہلی۔ اور وہ فرنگن ہاتھ ہلا ہلا کر فاروق حسین کو خدا حافظ کہہ رہی تھی اور میں کھڑکی سے نرس کی گود میں روتے ہوئے۔ بچے کو دیکھ رہا تھا —— اگر وہ بچہ بڑا اور سمجھدار ہوتا تو کبھی نہ روتا۔ وہ تو اپنے وطن جا رہا تھا۔ وطن جاتے ہوئے بھلا کوئی روتا ہے — ! مگر یہہ مجھے کیوں رونا آ رہا ہے — ؟ اس ایک ننھے سے بچے کے چلے جانے سے ہندوستان کی آبادی میں کونسا خلا پڑ گیا چالیس کروڑ میں سے ایک ہی تو کم ہوا —— یہہ وطن پرستی سے زیادہ خود غرضی ہی تو ہے کہ میں آئے دن ہزاروں ہندوستانی نوجوانوں کو فوج میں بھرتی ہو کر جاتے دیکھ رہا ہوں اور کچھ بھی محسوس نہیں کرتا لیکن اِس ننھے سے بچے کو ہندوستان سے باہر جاتا دیکھ کر رو دینا چاہتا ہوں — —— مجھے ان رنگروٹوں سے کوئی خطرہ نہیں۔ وہ اجنبی ممالک کو جاتے ہیں اور میں مطمئن ہوں کہ اب ان میں سے بہت سے واپس بھی [illegible] گے لیکن یہہ ذرا سا بچہ باہر جا رہا ہے تو کتنا بڑا اندیشہ پیدا ہو رہا ہے یہہ ہندوستان واپس آئے گا تو ایسے ہی جیسے ایسٹ انڈیا کمپنی کا کوئی تاجر۔ لندن سے واپس آنے کے بعد دہلی اُسے کیا پسند آئے گی دریائے ٹیمز کے پانی کی آلودگیوں میں رہ کر گنگا جل کے تقدس کا کیا یقین کرے گا

اور اپنی صورت آئینے میں دیکھ کر فاروق حسین کو اپنا باپ کیسے کہے گا — ؟
بس تاریخ ہی تو بدل جائے گی — !

ٹرین کے چلے جانے کے بعد جب میں پلیٹ فارم کا جنگلہ کود کر باہر نکلا تو پورٹر کی بیوی — وہ دنیا جہان کی محبوبہ اکیلا دروازے میں کھڑی تھی۔ اس کا سبز دوپٹہ اب اس کے گلے میں پڑا تھا۔ اور سر برہنہ تھا یعنی اس کا شوہر باہر چلا گیا تھا اور اب وہ سر پر دوپٹہ اوڑھنے کی قید و بند سے آزاد تھی۔ اور اس کا سبز لہراتا ہوا دوپٹہ سگنلنگ کر رہا تھا کہ ریل چلنے والی ہے — میں اس کو دیکھ کر مسکرانے لگا۔ پہلے تو وہ جز بز ہوئی شاید مجھے پہچانا نہیں — پھر خود بھی مسکرانے لگی۔ اس کی مسکراہٹ میں پہچاننے کا کوئی حوالہ نہیں تھا۔ میں جب اس کے قریب گیا تو جھٹ اس نے پلو سر پر اوڑھ لیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ اس کا بوڑھا ناتھ کھانستا کھانستا چلا آرہا تھا۔ میں ناچار اپنی پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ٹھنڈی سانسیں بھرتا آگے نکل گیا — میرا دل آج بہت باتونی ہو گیا تھا۔ کہہ رہا تھا — ارے عورتوں کو اب بوڑھوں کے لیے چھوڑ دو۔ تم جنگ پر جاؤ۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر جاؤ۔ اور واپس لوٹتے ہوئے ایک عدد آرٹسٹک موڈ والی کو نہ بھولنا۔ اگر اپنی اولاد کو انسان بنانا چاہتے ہو تو کالی آنکھوں کی بُری نظروں اور کالی زلفوں کی مسموم چھاؤں سے بچالو۔ یہاں کی جاہل عورتوں کی گود میں انسان پیدا نہیں ہو سکتا۔ یہاں کی عورتوں کو بس بوڑھے شوہروں کے لیے قحبہ خانوں کے لیے، بھیک مانگنے کے لیے

چھوڑ دو ــــــ اس میں تمھارا کوئی قصور نہیں۔ کالی آنکھوں اور کالی زلفوں کا مقسوم ابتدا ہی سے سیاہ ہے۔ تم نے ٹھیکہ تو نہیں لے رکھا ہے ــــــ؟"

میں اپنے دل کے اس کڑوے کسیلے وعظ سے اکتا گیا تھا۔ اسی لیے اس کو چپ کرنے کے لیے میں ہر راہ چلتی عورت کو گھور گھور کر دیکھتا اپنا دھیان بٹاتا رہا۔

اور شام کو جب تھک تھکا کر گھر لوٹا تو نوح کو آج کی دلچسپ سیر کی روداد سنائے بغیر ہی رات کے دس بجنے سے پہلے سو گیا۔

اور اس رات میرے خوابوں میں ان گنت زہریلی ناگنیں اور بیشمار سنپولے رینگتے رہے ــــــ

نیلام

سویرا ہوا۔ شاید یہہ ہماری زندگی کا پہلا سویرا تھا کہ ہم پڑوس کے بچوں کے رونے، بوڑھوں کی کھانسی، بھکاریوں کی صدا کے بجائے ڈھول تاشے اور نفیریوں کی آواز سے جاگے۔ میں نے الف لیلیٰ کے ہیرو ابوالحسن کی طرح نوح سے پوچھا۔ "کہیں میں خلیفہ تو نہیں بن گیا ——؟" نوح نے میری گردن پر ایک دھپ رسید کرتے ہوئے کہا۔

"تم خلیفہ تو بن گئے ہو مگر یہہ نفیریاں پڑوس کے گھر میں بج رہی ہیں ظفر کی محبوبہ بوڑھے صلاح الدین کی گھنی داڑھی میں پناہ لینے والی ہے"

میں نے ایسا محسوس کیا جیسے میں ہی ظفر ہوں اور گھبرا کر پوچھا۔

"اب کیا ہوگا ——؟"

نوح نے بڑے جہاندیدہ انداز میں جواب دیا "کچھ نہیں ہوگا —— اور پھر سب کچھ ہوگا"

ہم دونوں غیرارادی طور پر صحن کی دیوار کے سوراخ کی طرف دیکھنے لگے۔ پہلے یہہ سوراخ صرف سوراخ نہیں تھا بلکہ روحوں کا رہگذر اور اب صرف ایک سوراخ جو کھلا رہنے کے باوجود بند تھا۔ ایک ایسا رہگذر جو

ممنوع ہو گیا ہو۔ بھئی کیا کہنے انسان کی طاقت کے۔ جسم تو جسم روح پر بھی قبضہ ہے۔ سوراخوں، کھڑکیوں، چلمنوں سے چوری چھپے نکلی ہوئی روحیں بھلا کب شاد کام ہو سکتی ہیں، جب تک وہ قاضیوں کے ایجاب و قبول اور پروہتوں کے اشلوک پڑھتے ہوئے باجوں، نفیریوں اور تاشوں کے شور میں علی الاعلان گھر کے صدر دروازے سے باہر نہ نکلیں۔

میں یہی سوچتے سوچتے بولنے لگا۔ "وہ لڑکی بیوقوف ہے! در حقیقت اس کا منظر ہرہ۔"

نوح بولا — "تم جانور ہو — محبت کو بیوقوفی کہتے ہو۔"

میں نے نوح کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "تم جانور ہو — محبت ایک بیوقوفی ہے۔ یعنی ایک کمزوری۔ انسان تو ایک طاقتور مخلوق ہے اسی لیے محبت کو انسانی صفت کہنا انسان کی توہین ہے۔"

نوح تڑپ گیا اور اپنے دل کو تھامتے ہوئے غضبناک ہو کر بولا — "چپ رہو — تمہاری خرافات سے میرے دل پر چوٹ لگ رہی ہے تم کیا جانو — ارے تم کیا جانو کہ محبت کسے کہتے ہیں۔ محبت کو کمزوری کہتے ہو — کاش میں جذباتی ہوتا اور تمہارا گلا گھونٹ دیتا —!"

مجھے کسی انسان کو چوٹ کھا کر تڑپتے دیکھنے میں بڑا لطف آتا ہے اس کو میں اپنی فتح سمجھتا ہوں مگر نوح کا دل پر ہاتھ رکھ کر اسے تھام لینا مجھے ایک شبہ میں مبتلا کر رہا تھا کہ ابھی مجھے فتح نہیں ہوئی — اسی لیے میں نے

پھر ایک کوشش کی "تم اب بھی جذباتی ہو اور میں تمھارے اسی موڈ سے فائدہ اٹھاؤں گا۔ تم ہی بتاؤ کہ محبت میں جنسی تلذذ کیوں اس قدر داخل ہے۔؟ اگر دنیا میں صرف مرد ہی مرد ہوتے یا عورتیں ہی عورتیں ہوتیں تو شاید محبت کا لفظ لغت میں بھی نہ دکھائی دیتا ——— !"

نوح ابھی تک غضبناک نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا جھنجلا کر بولا۔ "اور یہ مائیں جو بچوں سے محبت کرتی ہیں۔ اس کا تمھاری الٹی کھوپڑی میں کیا جواب ہے۔؟

میں جیت رہا تھا۔ ظفر مند مسکراہٹ سے بولا ——" اس کو تم محبت کہتے ہو۔ ارے یہہ تو صرف خود غرضی ہے۔ ماں بچے سے صرف اسی لیے محبت کرتی ہے کہ وہ اپنی زندگی کو پورے نو مہینے خطرے میں مبتلا رکھ کر اس کو پیدا کرتی ہے۔ وہ خود موت کے منہ میں جا کر ایک بچے کی زندگی لاتی ہے اس کا بچہ اس کی اس خطرناک مہم کو سر کر لینے کا انعام ہے۔"

نوح اس گفتگو کو ختم کر دینا چاہتا تھا لیکن وہ گفتگو کو ختم کرنے کی کوشش میں گفتگو کو اور بھی الجھا دیتا ہے۔ میں بھی چاہتا تھا کہ اب یہہ فضول بحث، زبردستی کی گفتگو ختم کر دی جائے لیکن نوح کے اس جملے سے مجھے پھر بولنا ہی پڑا۔ نوح نے کہا تھا "تم میں انسانیت فنا ہوتی جا رہی ہے۔ اسی لیے چپ رہو۔ ماں کی بچے سے محبت خود غرضی کبھی نہیں کہی جا سکتی۔"

مجھے جواب دینا ہی پڑا "یقیناً خود غرضی ہے ——— اگر خود غرضی نہیں ہے تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب آگے کیا کہا جائے۔ میں خود بوکھلا گیا۔ میری

اس بوکھلاہٹ سے نوح کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا مگر میں نے فوراً ہی سنبھل کر کہا۔
"بھئی میں یہہ کہہ رہا تھا کہ اگر ماں بھی اسی طرح بچہ پیدا کرتی جس طرح مرغی انڈا چھوڑتی ہے تو بچوں کی خاطر جو عصمت فروشی ہوتی ہے وہ کم از کم معرض وجود میں نہ آتی ——"
ممکن ہے نوح اس بوکھلائے ہوے جواب کا کوئی تلخ جواب دیتا اور میں اس سے اور بھی الجھ پڑتا لیکن اچانک باہر کا دروازہ کھلا۔ اور ہم دونوں کے منہ سے خوشی کی چیخیں نکلیں ——

"ارے ظفر ——!"

"ظفر ——!"

ہم دونوں دوڑ کر اس سے لپٹ گئے۔ اس سے پوچھتے رہے کہ وہ اتنے عرصہ کہاں رہا۔ کیسے رہا۔ اس کی صحت اتنی خراب کیوں ہو گئی ہے۔ لیکن اس کے ہونٹ بھنچے ہوے تھے اور چہرے پر خوشی کی ایک کرن بھی دکھائی نہ دیتی تھی۔ کیا اتنے عرصے بچھڑے رہنے کے بعد اپنے بے تکلف دوستوں سے ملنے سے اس کو کوئی خوشی کوئی مسرت نہیں ——؟
ظفر اپنے گلے کو ہم سے چھڑا کر پرانی آرام کرسی پر جس کا نام ہم لوگوں نے "قدیم نسخہ" رکھ چھوڑا تھا بیٹھ گیا۔ اور ایک سگریٹ سلگائی —— نوح سوالات پر سوالات کئے جا رہا تھا لیکن ظفر مرکش کے ساتھ ایک ٹھنڈی سانس کے ذریعہ گاڑھا غلیظ دھواں باہر اگلتا چپ چاپ پڑوس کے گھر سے اٹھتی ہوئی شہنائیوں کی آواز سن رہا تھا اور اس کی نگاہیں صحن کے

سوراخ پر لگی ہوئی تھی۔

میں پہلے ہی ظفر کو بھانپ گیا تھا اس لیے اس کو دلاسا دینے کی خاطر میں نے اپنی وہ گفتگو جو ظفر کی آمد نے منقطع کر دی تھی پھر سے شروع کی۔ "ظفر ـــــ تم بہت دنوں بعد ملے ہو اس لیے ہمارے لیے نئے ہو۔ جیسا کہ ہند وستانیوں کا پرانا دستور ہے۔ وہ اپنا ہر خانگی یا سیاسی لاینحل مسئلہ نئے آدمیوں کے سامنے فیصلے کے لیے پیش کرتے ہیں اسی لیے میں بھی تم سے رجوع کرتا ہوں۔"

نوح بیچ میں بول اٹھا۔ "ظفر ـــــ تم تھکے ہارے ہو۔ یہ تمھارا دماغ کھا جائے گا اس سے کہہ دو کہ میں کچھ بھی نہیں سننا چاہتا ـــــ"

ظفر نے ایک گہری سانس لی اور کہا "نہیں ـــــ خلیل کو کہنے دو۔ مجھے یقین ہے کہ وہ وہی کہے گا جو میں اس وقت سننا چاہتا ہوں اور میں خلیل سے درخواست کروں گا کہ وہ بات کے آغاز سے قبل یہ وعدہ کر لے کہ وہ میرے دل کے ہر زخم کو اپنے تیز ناخنوں جیسی باتوں سے کھرچ کھرچ کر اور بھی ہرا کر دے گا ـــــ"

نوح کے بولنے سے قبل ہی میں نے مسکراتے ہوئے نوح کی طرف دیکھا اور کہنے لگا۔ "بہت اچھے ظفر! ـــــ تم مطمئن رہو۔ میں تمھارے دل کے ہر زخم کو کھرچ دوں گا۔ بلا رو رعائیت۔ اور اگر پرانے زخم کم ہیں تو میں نئے نئے گھاؤ بھی لگاتا جاؤں گا ـــــ سنو ابھی ابھی نوح سے بحث ہو رہی تھی کہ محبت کیا ہے ـــــ؟ نوح نے اس کا جواب دینے کے بجائے

دل پر ہاتھ رکھ رکھ کر مجھے مرعوب کرنا چاہا۔ اور میرا استدلال یہہ ہے کہ محبت صرف ایک خود غرضی ہے۔ اب تم ایک شخص ثالث کی طرح فیصلہ کرو کہ کون سچا ہے ——؟

ظفر نے دو ایک لمحے خاموش رہکر ایک سگریٹ جلائی اور دیا سلائی کے بکس سے کھیلتے ہوئے کہا "تم سچ کہتے ہو ——"

ظفر کے اس جواب سے میں جیتا۔ مجھے خوشی سے اچھل پڑنا چاہیے تھا لیکن معًا میں نے ایسا محسوس کیا جیسے ظفر نے مجھے جھٹلا دیا۔ اور میں خود اپنے آپ کو جھٹلا رہا ہوں —— دراصل میں بھی محبت کا قائل ہوں۔ کون ہے جو محبت کا قائل نہیں لیکن یہہ ردِ عمل محض اتفاقاً مجھ میں پیدا ہوا ہے میں محبت کو مانتا ہوں۔ محبت کے بغیر زندہ ہی نہیں رہ سکتا۔ لیکن زندگی سے اتنا مجبور ہو گیا ہوں جیسے آستین میں چراغ چھپا کر چوری کرنے نکلا ہوں۔ مجھے آٹھوں پہر اپنی بیوی فاطمہ کی یاد ستاتی رہتی ہے۔ اس کو ایکبار دیکھ آنے کی تمنا مجھے ہمیشہ بے چین رکھتی ہے —— بخدا اس تمنا میں جنسی تلذذ کو بہت ہی کم دخل ہے۔ مجھے اس سے صرف ملنے کی تمنا ہے —— پھر اس —— کشش کو کیا کہا جاتا ہے ——؟ اور پھر محبت کیا ہوتی ہے ——؟

نوح نے موقع سے فائدہ اٹھا کر ظفر پر چوٹ کی "یہہ کیوں نہیں کہتے کہ جلیل اس لیے سچا ہو گیا کہ تم محبت میں ناکام رہے ——"

ظفر بپھر گیا "میں محبت میں ناکام رہا ——؟ یہہ کبھی نہیں ہو سکتا میں اب بھی اس لڑکی سے محبت کرتا ہوں —— آج اگر اس کے جسم کا نیلام

ہو رہا ہے۔ ہونے دو۔ میں جسموں کا خریدار نہیں۔ میں تو روح کا گاہک ہوں مجھے اپنی محبوبہ کی روح چاہیے تھی۔ وہ مجھے مل گئی۔ روحوں کا نیلام نہیں ہو سکتا۔ یہہ تو بہت ہی اچھا ہوا کہ اس لڑکی کی شادی کسی اور سے ہو گئی۔ اب میری محبت سوز میں داخل ہو گئی ہے۔ اور بغیر سوز محبت کا میں قائل ہی نہیں۔"

نوح نے ظفر کی زبان چلنے نہ دی۔" ہاں ہاں ——— بڑے بڑے فلسفے بگھارو ——— اب رہ کیا گیا ہے تمھارے پاس سوائے ان فلسفوں کے۔ تمھیں دیکھ کر تو مجھے وہ پہلوان یاد آتا ہے جس نے پچھڑ جانے کے بعد بھی ٹانگ اس لیے اٹھا دی تھی کہ تماشائی یہہ سمجھیں کہ وہ ابھی نہیں پچھڑا ——"

نوح کا جواب معقول تھا۔ بالکل سچا۔ اسی لیے ظفر کو بھی خاموش رہنا پڑا اور مجھے بھی ——— ہم تینوں چپ چاپ شہنائیوں کے شور کو سنتے رہے۔ اور جب ظفر کی حالت پر ان شہنائیوں میں اس کی ناکام محبت کی چیخوں نے برا اثر ڈالنا شروع کیا تو ہم اس کو لے کر باہر نکل گئے ——— شہنائیاں اور اسی قسم کے باجے جو مسرت کے اظہار میں بجائے جاتے ہیں ان سے مسرت کے اظہار کے بجائے انسان کی فطری کمینگی کا اظہار ہوتا ہے۔ مجھے ان شہنائیوں کی آواز میں فرعونیت کی مسموم بو آتی ہے۔ یہہ شور انسان کو دو فرقوں میں بانٹ دیتا ہے۔ ایک فرقہ وہ جو اس کا شور سن کر کان کی لوؤں تک باچھیں کھول کر مسکراتا ہے اور دوسرا اس شور کو سن کر اپنے آنسو روک ہی نہیں سکتا۔ میں جانتا ہوں کہ یہہ غم کوئی ایسا جذبہ نہیں جو انسانی برداشت سے باہر ہو لیکن یہہ انسان ہی ہے

جو دوسرے انسان کے غم کو ناقابلِ برداشت بنا دیتا ہے۔ ظفر اپنی ناکام محبت پر شاید ایک دو آنسو بہاتا لیکن یہ شہنائیوں کا شور اس کو آٹھ آٹھ آنسو رلا رہا ہے ——— میں اگر دنیا کا کوئی بہت با اختیار انسان ہوتا تو نہ کوئی ملک فتح کرتا اور نہ کسی کو غلام بناتا بلکہ صرف ایک ہی کام انجام دیتا کہ دنیا کی فضا میں شہنائیوں کا شور کبھی نہ گونجنے پائے ———

آدھی رات کے قریب جب ہم گھر لوٹے تو دروازے کے قریب ہمیں سپید چادر میں لپٹی ہوئی ایک عورت دکھائی دی۔ ظفر نے ایک تیز تنفس میں کہا۔

" وہ ہے ——— وہی ہے ——— وہی ہے "۔

لیکن چادر میں سے ایک ایسی آواز آئی جس میں بڑھاپے کا پوپلاپن تھا۔ اس نے ایک چٹھی ظفر کی طرف بڑھائی۔ میں نے دیا سلائی جلائی۔ اور دیا سلائی کی روشنی میں ظفر نے پڑھا۔

" ظفر ——— للہ مجھے بچاؤ۔ گیارہ بجے میں پچھواڑے کے دروازے پر تمہارا انتظار کرونگی "۔

ظفر نے دیا سلائی کے بجھنے سے پہلے ہی وقت دیکھ لیا ——— ایک بج رہا تھا۔ کمبخت بیوقوف بڑھیا ——— اب کیا ہو سکتا تھا۔ اب تو دلہن کے گھر کے دروازے پر تاشے اور نفیری بہت بلند آہنگ شور مچا رہے تھے۔ اور گھنیری داڑھی والا دولہا گھوڑے پر اکڑ اکڑ کر بیٹھنے کی کوشش میں بار بار پیچھے سرخ پردوں والی پالکی کو دیکھ رہا تھا جس میں اس کی نواسی جیسی دلہن بیٹھی ہوئی تھی۔

"اب کیا ہوسکتا ہے ــــــــ اب کیا ہوسکتا ہے۔"
ظفر بڑبڑا رہا تھا۔ ظفر کی حالت بہت خراب ہوتی جارہی تھی اسی لیے ہم اس کو زبردستی اندر لے گئے اور نوح نے اس خوف سے کہ کہیں ظفر ہمیں سوتا چھوڑ کر بھاگ نہ جائے۔ اپنے سوٹ کیس کا قفل باہر دروازے پر لگا دیا ــــــــ

اندر ظفر دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا اور باہر شہنائیاں اپنے ارد گرد کافی دور تک آنکھوں کی نیند اور رات کا سکوت چھین رہی تھیں۔

محبت

ظفر کی محبوبہ کی شادی کو پانچ روز ہوگئے مگر ظفر کو جانے کس امید کا سہارا تھا کہ پہروں صحن کی دیوار والے سوراخ میں نظریں گاڑے بیٹھا رہتا۔ یہ کوئی عجیب بات بھی نہیں ہے کیونکہ میں نے خود ایسے انسانوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے جو مشہور ڈاکٹروں کے جواب دیدینے کے باوجود زندگی کی امید رکھتے ہیں۔ میں نے ظفر کو تسکین دینے کی خاطر ایکبار یہ بھی کہا ــــ

"کیوں بیکار اب اس سوراخ میں اپنی نگاہیں لگائے بیٹھے ہو۔ اب اس سے کسی تجلی کی امید فضول ہے۔ اپنی نگاہیں ذرا اس سوراخ سے ہٹا کر اس پھیلی ہوئی دھرتی کا جمال دیکھو۔ اپنی نظروں کو ذرا زمین و آسمان کی وسعتوں میں تو پھینکو ــــــــ تم نئے سرے سے جینے لگو گے ــــــ"

ظفر نے اسی سوراخ کو ٹکٹکی لگائے دیکھتے ہوئے کہا "اب مجھے دنیا کا جمال نہیں دیکھنا ہے۔ اب میری نظروں کو اور وسعتوں کی ضرورت نہیں۔ تم نہیں جانتے کہ اس لڑکی کے چہرے پر نظریں ڈالنے سے نظریں سکان اُمکان کی وسعتوں سے زیادہ وسیع ہو جاتی ہیں۔"

نوح بولا ـــــ اب تو اس کا چہرہ دوسرے آدمی کی نظروں نے

خرید لیا ہے۔ اب تمھیں اس سے کیا لینا دینا رگیا ہے ـــــــ؟
ظفر نے جواب دیا "مجھے اس سے کچھ بھی لینا دینا نہیں ہے۔ میں اس کو شادی کے بعد صرف ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں کہ اب وہ کیسی ہے"۔
نوح ظفر کو فوراً ہی سمجھ گیا۔
"یہہ تمھارا کمینہ پن ہے ظفر ـــــــ"
ظفر نے ایک سیدھی سادھی سی بات کہی تھی لیکن نوح نے ظفر کی بات کو ایک معمّہ بنا دیا ـــــــ بھلا یہہ کمینہ پن کیا ـــــــ؟ میں نے پوچھا۔
"کیا مطلب ـــــــ؟"
نوح جیسے میرے پوچھنے سے پہلے ہی اس جملے کا مطلب سمجھانا چاہتا تھا۔
"مطلب یہہ کہ ظفر اس لڑکی کو اس حال میں دیکھنا چاہتا ہے کہ وہ اس کی محبت میں نڈھال نیجان، پژمردہ بلکہ مردہ نظر آئے ـــــــ یہہ منظر دیکھ کر ظفر صاحب کی مسرت کا ٹھکانہ نہ رہے گا ـــــــ اور اگر وہ لڑکی اس تشنۂ کام محبت کی آگ سے جھلس کر مر جائے تو ظفر صاحب فخریہ انداز میں اپنی داستانِ عشق سنایا کریں گے کہ ان کی خاطر ایک عورت نے جان دے دی۔"
میں نے کہا "یہہ تو بہت اچھا ہوگا۔ تم کو معلوم تو ہو جائے گا کہ محبت کس کو کہتے ہیں"۔
نوح چڑ کر بولا ـــــــ "یار۔ تم بھی تعالی کے بینگن ہو۔ کل ہی تو کہہ رہے تھے کہ محبت کوئی چیز نہیں اور آج کہتے ہو کہ محبت بھی کوئی چیز ہے"۔

میں نے جواب دیا "جب تک میری بیوی کی محبت مجھے ستاتی رہے گی اور میں وطن سے دور رہوں گا۔ کبھی محبت کا قائل رہوں گا اور کبھی منکر ——— سمجھے؟"

ظفر نے نوح سے کہا "لو ——— میں بتاتا ہوں کہ محبت کیا ہے ——— ؟"

نوح نے جواب دیا "میں سننا نہیں چاہتا۔ میں نے تم سے بھی بڑے بڑے عاشقوں کو محبت کی تعریف کرتے سنا ہے مگر جس طرح لوگ خدا کے وجود اور عدم وجود پر بحث کرتے کرتے تھک کر اعتقاداً اس کو مان لیتے ہیں اسی طرح اعتقاداً میں بھی محبت کو مان لینے پر مجبور رہوں۔ ورنہ سچ پوچھئے تو خدا اور محبت دونوں کے وجود کے بارے میں کبھی کبھی میرے دل میں شکوک پیدا ہو جاتے ہیں۔"

میں بستر سے اٹھ بیٹھا اور فاتحانہ مسکراہٹ میں بولا "میں نے تمہارا شبہ دور کر دیا۔ سنو در اصل محبت ہی خدا ہے۔ یا خدا محبت ہے۔ تم نے ٹالسٹائی کا وہ افسانہ پڑھا ——— جہاں محبت ہے وہاں خدا ہے۔"

نوح چڑ کر بولا۔ "تم ہمیشہ باہر والوں کی مثالیں کیوں دیتے ہو جب تم کو یہ معلوم ہے کہ میں مالابار، کارومنڈل اور ہمالہ کے باہر کی ہر چیز سے نفرت کرتا ہوں چاہے باہر کی چیزیں ہمارے لیے مفید ہی کیوں نہ ہوں لیکن میں اسی جذبۂ تنفر میں ہندوستان کی نجات سمجھتا ہوں۔"

میں نے اس پر طنز کیا۔ "مگر تم تو سوویٹ روس کے بڑے دلدادہ ہو۔"

اس نے جواب دیا "میں سوویٹ روس کا صرف اسی لیے دلدادہ ہوں کہ

روس میں ہندوستان کے خط وخال جھلکتے دیکھتا ہوں۔ اس کی سرخ انقلاب سے پہلے کی زندگی اور موجودہ ہندوستانی زندگی میں بہت مشابہت ہے۔ بلکہ آج کل بھی روسی تمدن اور ہندوستانی تمدن میں بہت ساری باتیں مشترک ہیں۔ کچھ دنوں پہلے میں نے ایک روسی فلم دیکھی تھی ——— نارتھ اسٹار ——— میں نے دیکھا ہے۔ وہاں کا حسن، وہاں کی عورتوں کی چوٹیاں، ان کے لہنگے ان کا ناچ، مزدوروں اور کسانوں کا طرز زندگی بچوں کے عادات واطوار سبھی کچھ تو ہندوستانیوں سے ملتے جلتے ہیں۔"

میں نے گفتگو میں تاریخ الٹ دی "یہ کوئی بات نہیں۔ ہندوستانی نسل دنیا کی پہلی نسل ہے۔ آدم علیہ السّلام کو بیر سراندیپ کیوں کہا جاتا ہے۔؟ دنیا کی ساری نسلیں یہیں سے پھیلیں۔ صرف روس ہی کیا بلکہ دنیا کے ہر ملک میں ہندوستانی نسل کسی نہ کسی روپ میں پائی جاتی ہے۔"

ظفر اس گفتگو سے اکتا رہا تھا اسی لیے اس نے نوح کو اپنی طرف متوجہ کر لیا "ارے کیا بیکار باتیں کر رہے ہو۔ بات محبت کی ہو رہی تھی اور تم ماسکو پہنچ گئے اب میں تمھیں ماسکو سے پھر ہندوستان واپس لانا چاہتا ہوں۔ محبت کا عملی ثبوت دیکھنا چاہتے ہو تو ایک کاغذ اور پنسل لاؤ۔"

نوح بولا ——— "کاغذ اور پنسل آج تک کوئی عمل نہ کر سکے۔"

ظفر نے کہا ——— "تم لے تو آؤ ——— میں اپنی محبوبہ کو چٹھی لکھوں گا۔"

نوح نے ایک کاغذ اور پنسل اسے دیا مگر اس کو جتا دیا کہ کوئی ایسی ویسی بات نہ لکھنا کہ سر منڈاتے ہی اولے برسنے لگیں ظفر کو اپنی محبت پر بہت اعتماد

تھا۔ اس نے کہا "اگر یہ چٹھی سیدھی اس لڑکی کے پاس پہنچ گئی۔ تو کچھ بھی نہ ہو گا۔
یہ کہہ کر اس نے چٹھی رکھی اور باہر گیا۔ باہر اس لڑکی کا چھوٹا بھائی
جس کی عمر غالباً سات سال تھی لٹو گھما گھما کر کھیل رہا تھا۔ ظفر نے اس کو اندر
بلا لیا وہ کیک کا ٹکڑا جو نہ معلوم کب سے ظفر نے اپنی جیب میں چھپا کر رکھا تھا
اس کو دیا اور پھر ادھر ادھر کی باتیں پوچھنے لگا "باجی ——— کہاں
ہیں تمہاری ——— ؟" "گھر میں" "اچھا تو ہمیں بیٹھ کر بتاؤ کہ وہ کیا کر رہی ہیں یہ
دیکھیں تم کس طرح صحیح بتا سکتے ہو ——— ! اگر صحیح صحیح بتا دیا تو ہم تمہیں ایک
کیک اور دیں گے"

بچہ مچلا ——— "نہیں مجھے کیک نہیں چاہیے۔ مجھے ایک پتنگ لا دیجئے
اور بہت سی ڈور بھی ———"

ظفر اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا ——— "ہاں ہاں ———
ہم تمہیں بہت سی پتنگیں لا دیں گے اور بہت سی ڈور بھی ——— اب بتاؤ ——— ؟

بچہ خوش ہو کر بولنے لگا "واہ یہ کون بڑی بات ہے ——— ؟ وہ
ابھی ابھی نہا کر آنگن میں دھوپ سے بال سکھا رہی ہیں"

ظفر نے لڑکے سے یونہی کھیلنے کے لیے کہہ دیا "جھوٹ ——— !

بچہ سادگی سے بولا ——— "اللہ کی قسم"

ظفر نے اپنی جیب سے ایک روپیہ نکال کر دیتے ہوئے کہا "یہ لو ایک
روپیہ ——— اب بہت سی پتنگیں اور مٹھائی خرید لینا۔ اب ہمارا ایک کام
کرو۔ دیکھو یہ چٹھی چپکے سے اپنی باجی کو تو دے آؤ ——— دیکھو امی ابا وغیرہ

کسی نہ کو نہ دینا۔ باجی اکیلی ہوں تو دینا ــــ سمجھے ۔؟

سات سالہ بچہ کیا جانے کہ یہ چٹھیاں کیا ہوتی ہیں ــ ؟ اور کیوں لکھی جاتی ہیں اور ان کے لکھنے سے کیا ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اس نے چٹھی لی۔ دوڑا دوڑا چلا گیا اور ظفر نے نوح کو خاص طور پر مدعو کیا " آؤ ـــ وہ آنگن ہی میں بیٹھی ہے۔ حمام کے سوراخ سے صاف نظر آتا ہے۔ اس میں سے دیکھ لو اگر میری چٹھی پا کر اس کی آنکھوں میں ایک ننھا سا آنسو آجائے یا ایک ٹھنڈی سانس ہی نکل جائے تو سمجھ لو کہ وہ محبت کے جال میں پھنسی ہے "۔

ہم تینوں حمام کے سوراخ سے جھانکنے لگے۔ وہ لڑکی اکیلی ہی آنگن میں بیٹھی اپنی لمبی لمبی بھیگی زلفوں کو پھٹکار رہی تھی۔ اس کا ننھا سا بھائی دبے دبے قدموں اس کے پیچھے آیا اور زور سے " ہاؤ " کر کے اسے ڈرا دیا۔ مگر اب وہ ڈری نہیں۔ چونکی نہیں اٹھی۔ اب وہ کن خیالوں میں ڈوبی رہ سکتی ہے ۔؟ جن خوابوں میں ابتک وہ ڈوبی رہتی تھی وہ تو پورے ہو گئے تھے۔ لڑکیاں تو صرف شادی تک ہی تخیلی رہتی اور خواب دیکھا کرتی ہیں! ادھر شادی ہوئی اور ادھر دن بھر بلکہ رات رات بھر جاگتی رہتی ہیں۔

بچے نے جب اس کی طرف چٹھی بڑھائی۔ تو اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے وہ چٹھی لی اور دو لمحوں میں پڑھ ڈالی اور اپنی بلاوز میں اڑس کر اندر کے کمرے میں چلی گئی۔

شام تک نہ کوئی نامہ نہ پیغام زبانی آیا۔ البتہ رات میں دس بجے کے قریب اس لڑکی کی رازدار بڑھیا ایک چٹھی لیے آئی۔

جناب ـــــــ مہربانی کرکے آیندہ سے مجھے کوئی چٹھی نہ لکھیے۔ میں آپ سے محبت کرتی تھی مگر اب میں اپنے شوہر کی خدمت گزاری میں زندگی گزار دوں گی۔ امید کرتی ہوں کہ آپ مجھے آیندہ اس طرح بدنام کرنے کی کوشش نہ کریں گے۔"

ہندوستان میں گھر گھر اب تک جو محبتیں کی گئیں ہیں ان میں یہہ جملہ ہمیشہ استعمال ہوا کہ "آپ بدنام کرنے کی کوشش نہ کریں گے یا نہ کریں گی ـــــــ مگر ظفر اس بڑھیا کے چلے جانے کے بعد تکیے میں منہ چھپا کر بے اختیار رونے لگا۔ میں ظفر کو تسلی دینے لگا۔

اب اس کو بھول جاؤ ظفر ـــــــ تم اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو اس کو بھول جاؤ ـــــــ یہہ ہندوستان کی لڑکیاں بڑی کمزور، ڈرپوک بلکہ پاگل ہوتی ہیں۔ ان میں خود اعتمادی نام کو بھی نہیں ہوتی پھر ان کی محبت پر کیا اعتماد کیا جاسکتا ہے ـــــــ؟ جب تک یہہ لڑکیاں اپنے والدین، سوسائٹی اور جھوٹی شرم کے پھندوں میں پھنسی ہوئی ہیں محبت نہیں کرسکتیں۔"

نوح کو ظفر کی اس حالت سے بہت ہمدردی تھی۔ اس لیے ظفر کو اس کی محبوبہ بلکہ تمام لڑکیوں سے تنفر کرنے کے لئے کہا۔

"نہیں جی ـــــــ ان لڑکیوں کی محبت اسی وقت تک ہے جب تک کہ ان کی جوانی تھمی ہوئی ہے ادھر جوانی بہہ نکلی اور ادھر محبت وحبت سب بھول گئیں۔ اب اپنی ہی محبوبہ کو دیکھو جب تک جوانی رکی ہوئی تھی راتوں کی نیند اڑ گئی تھی۔ جسم کا عضو عضو پیاسا ہو رہا تھا۔ آٹھوں پہر ظفر کا نام لیتی تھی

شوہر نے اس کی جوانی کا بند توڑ دیا ہے۔ اس کے جسم کی بوٹی بوٹی کو تھکا کر میٹھی نیند کے آغوش میں پھینک دیا ہے تو اس کی روح کی پیاس بھی بجھ گئی —— وہ صرف یہی چاہتی تھی۔ چاہے یہہ پیاس ظفر بجھا دے چاہے وہ بوڑھا شوہر —— یہہ خود غرضی ہے۔ میں کہتا ہوں محبت صرف خود غرضی ہے۔"

نوح کے ان زہریلے جملوں اور ظفر کی سسکیوں سے میرے دل پر ہتوڑے سے برس رہے تھے۔ میں اس کو روکنا ہی چاہتا تھا کہ باہر کا بڑا دروازہ زور سے کھلا اور ایک سایہ جھومتا ہوا داخل ہوا۔ لالٹین کی روشنی میں آیا تو میں خوشی سے چیخ اٹھا —— "جھندر ——"

ظفر بھی اپنی سسکیوں کو بھول کر اٹھ بیٹھا۔ میں مسرت سے دوڑ کر اس سے لپٹ گیا۔ اور اس کو اندر کھینچنے لگا مگر وہ دالان کے ستون کو مضبوطی سے پکڑے کھڑا رہا۔ نوح اور ظفر نے بھی اسے منانا چاہا لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ ہم تینوں یہہ سمجھ رہے تھے کہ شاید وہ نئی ایکٹنگ کر رہا ہے۔ اپنی اس انوکھی ملاقات کو بالکل ڈرامائی انداز میں پیش کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ عرصہ سے بچھڑے رہنے کے بعد گلے شکوے کرتے ہوے ملنا ایک بہت ہی پرانا رواج ہے۔ اور ہم پرانے پن کے دشمن —— ہماری ہر حرکت میں تنوع اور نیا پن ہوتا ہے۔ جھندر شاید اسی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

چیتا

مہندر کی آنکھوں میں نفرت کے شعلے تھے۔

اس وقت نوح کو شرارت سوجھی اور وہ اپنی جیب سے ایک روپیہ نکال کر ہتھیلی پر رکھتے ہوئے چمکارنے لگا جیسے روٹی دکھا کر کتوں کو بلایا جاتا ہے۔

"چوچچ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چوچچ ــــــ آؤ ــــــ آؤ"

مہندر وہیں کھڑا غضبناک نظروں سے ہمیں دیکھتا رہا۔ ہم میں کیا تبدیلی ہوئی تھی جو یوں اس طرح غور سے وہ دیکھ رہا تھا۔ اصل میں تو وہ خود ہی بدل گیا تھا کہاں تھا وہ پہلوان مہندر جس کو ہم سب ہرقلس ثانی کہا کرتے تھے اور جو خود ہی کہا کرتا تھا کہ میں تناسخ ارواح کے علاوہ "تناسخ اجسام" کا بھی قائل ہوں۔ یقین نہ آئے تو مجھ میں قدیم یونان کے کسی ہیرو کو دیکھ لو۔ آج وہی مہندر وہ بھکاری نظر آ رہا تھا جس کا مہندر نے ایک مرتبہ مذاق اڑاتے ہوئے کہا تھا کہ یہ زندہ مردہ ہے۔

مہندر کو اسی طرح خاموش کھڑا دیکھ کر نوح نے اپنے مذاق کو ایک اور مہمیز لگائی۔ روپیہ اس کی طرف پھینک دیا۔ مہندر اب آگے بڑھا اور اس روپیہ کو اٹھا کر جیب میں رکھتے ہوئے ذرا اونچی آواز میں بولا ــــــ

"ابھی اور چودہ روپے دو ——"

ہم سب یہ سمجھے کہ مہندر اپنی اس غیر متوقع آمد کو واقعی ڈرامائی انداز میں پیش کر رہا ہے۔ اسی لیے میں نے ابھی اس کے استقبال میں بالکل تھیٹریکل آداب استعمال کیے۔

"آؤ اے بچھڑے ہوئے ساتھی۔ آؤ۔ پہلے ہمارے گلے سے لگ جاؤ۔ چودہ روپیہ کے بجائے ہم چودہ کروڑ روپیہ تم پر سے نچھاور کر کے خیرات کر دینگے"۔

مہندر آگے بڑھا۔ اب اس کا لہجہ اور بھی غضبناک ہو گیا تھا۔ "میں کہتا ہوں کہ مذاق نہ کرو۔ ظفر نے مجھ سے پندرہ روپے قرض لیے ہیں۔ وہ روپے مجھے واپس کر دو ورنہ میں سربازار تم لوگوں کو بے عزت کروں گا۔ میں تمھاری شیروانیوں کے کالر پکڑ لوں گا"۔

ہم تینوں اب متحیر ہو گئے۔ مہندر کی ان باتوں کا ہمیں کوئی افسوس نہیں تھا لیکن اس کی گری ہوئی صحت، اس کی انگارہ جیسی آنکھیں اور گرجتی آواز سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے شمع بھڑک رہی ہے شاید شمع بجھ بھی جائے گی۔

نوح نے اس کو ہاتھ پکڑ کر چارپائی پر بٹھانا چاہا لیکن مہندر نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ "نہیں —— میرے اندر بھڑکتی ہوئی آگ کو اپنی چکنی چپڑی باتوں اور قریب کھینچنے والی باہوں سے مت بجھاؤ۔ میرا قرضہ واپس کر دو۔ میں چلا جاؤں گا —— ہمیشہ کے لیے چلا جاؤں گا ——"

اور وہ بری طرح کھانسنے لگا۔

نوح اور میں اس کو سمجھانے لگے "مہندر —— بچپنا نہ کرو۔ دیکھو

یہاں بیٹھ جاؤ۔ تمہاری حالت بہت خراب ہوتی جا رہی ہے۔ تمہاری صحت ــــــ تمہارے جسم میں خون مطلق نہیں رہا ــــــ حیرت ہے کہ کھانسی کے اتنے شدید دورے پڑ نیکے بعد بھی تمہارے چہرے میں لہو کی ایک ہلکی سی دھار نظر آتی ہے ــــــ

مہندر چیخا ــــــ "بکواس نہ کرو ــــــ مجھے لہو کی دھار نہیں چاہیئے۔ مجھے صرف چودہ روپے چاہیں۔ میں اپنے آپ کو آخری فریب دینا چاہتا ہوں۔ سلطان بازار کے چوراہے پر مکھیاں مارنے والا ماہر جنسیات مجھے ایک انجکشن دینا چاہتا ہے۔"

ظفر نے پوچھا "انجکشن ــــــ بھلا کیا ہو گیا ہے تمہیں ــــــ؟"

مہندر اب کے بار ذرا دھیمی آواز میں بولا ــــــ "میرے چہرے پر مفلس کے یہ سیاہ دھبے دیکھ رہے ہو۔ جنہوں نے میرا خوبصورت چہرہ بگاڑ دیا ہے یہ مردانگی کے تمغے میری قارون نژاد محبوبہ نے عطا کیے ہیں لیکن اب میری موت قریب ہے۔ اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ میرا چہرہ ان سیاہ دھبوں سے پاک ہو جائے۔ کیونکہ وہاں جنت میں حوریں ہیں۔"

ظفر نے مہندر کی دھیمی آواز سے مطمئن ہو کر اب مذاق شروع کر دیا۔

"مگر بھیا ــــــ تم تو دوزخ میں جھونک دیئے جاؤ گے۔"

مہندر لا ابالی انداز میں بولا۔ مجھے پروا نہیں۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ اب کوئی حور جنت میں نہ رہ سکے۔ مجھے اپنے آپ پر اعتماد ہے۔ میں اپنی نظروں میں ایسی جنسی کشش رکھتا ہوں کہ کوئی حور جنت میں نہ رہ سکے گی۔ میں سب کو دوزخ میں کھینچ لوں گا۔"

نوح کلر کی پانے کے بعد سے خدا کو بہت زیادہ ماننے لگا تھا اسی لیے
بُرا مان گیا " شٹ اپ یو فول!"
نوح کی ڈانٹ سن کر مہندر کا غصہ بھر بڑھ گیا۔ اس کا نفس بھی تیز
ہو گیا اور وہ پھر بُری طرح کھانسنے لگا۔ کھانسی ابھی رُکی نہ تھی مگر اس نے
غالباً یہ خیال کیا کہ مبادا اس کھانسی میں اس کا دم اکھڑ جائے اور وہ
نوح کی ڈانٹ کا جواب نہ دے کر یعنی ہار کر مر جائے اس لیے کھانستے کھانستے
بڑی تکلیف سے بولا " کھوں ––– کھوں ––– تم ––– احمق تم ہو
خاموش رہو ––– کھوں کھوں کھوں ––– پہلے میرے چودہ
روپے واپس کر دو "
نوح نے پوچھا ––– " کاہے کے چودہ روپے مانگ رہے ہو "
مہندر غرایا " اتنی جلدی بھول گئے۔ یاد نہیں جب ظفر گڑگڑاتے
میرے پاس بھیک مانگنے آیا تھا ––– "
ظفر بولا ––– " ہم نے تو تم سے صرف پانچ روپیہ قرض لیا ہے۔"
میں نے اور نوح نے بھی تائید کی۔ مہندر بنیا تو نہیں تھا لیکن جانے
بنیا پن اس نے کہاں سے سیکھ لیا تھا۔ بولا " اور پانچ روپے کا سود –––
––– پرماتما کا شکر ادا کرو کہ میں نے صرف نو روپے سود لگایا ہے۔
ورنہ میں رعائیت نہ کرتا تو تم سب آج شاید جیل میں ہوتے "
ظفر کو شاید غصہ آگیا تھا۔ اس نے نوح کا بکس کھول کر چودہ روپے
کے نوٹ گن کر مہندر کے منہ پر دے مارے ––– مہندر نے زمین پر سے

سب نوٹ اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لیے دو ایک لمحہ تک ہمیں گھور گھور کر دیکھتا رہا اور پھر بڑی نفرت سے "آخ تھو" کی آواز کے ساتھ تھوک کا ایک بڑا سا خرخرہ بیچ دالان میں پھینکا اور تیز تیز دروازے کی طرف جانے لگا
——— لیکن دروازے تک پہنچتے پہنچتے موری کے پتھر سے ٹھوکر لگی اور وہ دھڑام سے اوندھے منہ گر پڑا۔

ہم تینوں بدحواس ہو کر دوڑے اور اس کو اٹھا کر نوح کے بستر پر لٹا دیا۔ اس کے منہ سے خون نکل رہا تھا اور وہ بیہوشی کے عالم میں بڑی ڈراؤنی آوازیں کراہ رہا تھا۔ ظفر دوڑا دوڑا اسلطان بازار کے مکھیاں مارنے والے ماہر جنسیات کے پاس گیا اور تھوڑی دیر بعد اس کو ساتھ لئے لوٹا۔ اس نے جھندر کی حالت دیکھ کر نا امیدی میں سر ہلا دیا جیسے اب وہ صحت یاب نہیں ہو سکتا ——— ہم خود بھی یہ نہیں چاہتے تھے کہ جھندر اب صحت یاب ہو۔ بلکہ اس کا اس ناقابل برداشت تکلیف میں مبتلا رہنا تو موت سے بھی زیادہ بھیانک تھا۔ لیکن جھندر چیخ رہا تھا کہ میں ایسی حالت میں نہیں مرنا چاہتا۔ مجھے اس بیماری سے نجات دیکر مار ڈالو۔ میں اس وقت مرنے کے لیے تیار ہوں۔ میں عورتوں اور حوروں سے دوسرے جنم میں بھی انتقام لینا چاہتا ہوں ———

اس ماہر جنسیات نے جھندر کو شہر کے سرکاری ہسپتال میں داخل کروانے کی رائے دی اور چلا گیا ——— اور ہم اسی شام کو اُسے ہسپتال میں داخل کرا آئے۔

- - - - - - - - - - - - - - - - - -

——— لیکن ہسپتال کی خوبصورت نرسوں کے متبسم پیارے رنگین ہونٹوں کو

وہ تین دن سے زیادہ نہ دیکھ سکا۔ بہشت کی حوروں اور دوسرے جنم کی عورتوں سے انتقام کی تمنا اسکے دل میں رہ گئی۔ جب اس نے اپنی آخری سانس ہسپتال کی تیز خوشبوؤں والی فضا میں پھینکی اس وقت کوئی بھی اس کے پاس نہ تھا۔
ایک نرس نے ہمیں بتایا کہ دم نکلتے وقت وہ اتنی بُری طرح چیخا تھا کہ ہسپتال کے دوسرے مریض بھی گھبرا کر چیخ اٹھے تھے۔ مہندرا اتنا بزدل نہیں تھا اگر کوئی ایک نرس بھی دم نکلتے وقت اس کے پاس ہوتی تو وہ کبھی نہیں چیختا۔ وہ ہنستا مسکراتا جان دیتا۔ وہ بھلا موت سے کیا ڈر سکتا تھا جبکہ وہ موت سے بھی زیادہ بھیانک زندگی میں مسکراتا ہوا پایا گیا۔
ہسپتال کے ایک چپراسی کی اطلاع پر ہم ہسپتال گئے۔ ہم اس کی لاش کے وارث تھے۔ اس کی لاش کو دیکھ کر یقین نہیں آتا تھا کہ وہ مر گیا ہے البتہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تھکن سے چُور ہو کر وہ اپنی عادتی لاپروائی سے بستر پر گر کر سو گیا ہے۔ ہر لاش پر موت کا گہرا اور ڈراؤنا سکوت چھایا رہتا ہے لیکن مہندر کی لاش پر موت کی پرچھائیں مطلق نہیں تھی۔ اس کے ہونٹ متبسم تھے اور چہرے پر ایسا استغنا برس رہا تھا۔ جیسے موت نے اسے ڈرا کر زیر نہیں کیا بلکہ اپنا حملہ کرنے سے پہلے اس سے اجازت مانگ لی تھی۔ اس کی بڑھی ہوئی داڑھی میں متبسم ہونٹوں کے خم اور پیشانی پر بل کھائے ہوئے بڑے بڑے بالوں کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ وہ موت سے لڑتا ہوا نہیں بلکہ گلے ملتا ہوا مر گیا ہے۔ مہندر کی لاش کو دیکھ دیکھ کر مجھے خیال آ رہا تھا کہ اس کو نہ نذر آتش کیا جائے اور نہ چیلوں گدھوں کے حوالے کیا جائے بلکہ قدیم مصر کے رواج کی طرح اس لاش کو حنوط کر کے شہر کے بیچ

بازار میں رکھا جائے اور ہندوستان آنے والے ہر بیرونی سیاح کو سب سے پہلے یہہ لاش دکھائی جائے وہ سیاح حیرت سے اس لاش کے متبسم ہونٹوں کو دیکھ کر کہیں گے۔ کتنے عجیب ہوتے ہیں یہہ ہندوستانی ـــــ! زندگی میں روتے ہیں اور موت کی آغوش میں مسکراتے ہیں" لیکن ان کو جب جھندر کی موت کا سبب معلوم ہوگا تو پھر سب کچھ معلوم ہو جائے گا کہ یہہ انسان زندگی میں روتے کیوں ہیں ـــــ؟ انھیں رُلانے والا کون ہے۔ اور یہہ موت کو اس مسرت سے خوش آمدید کیوں کہتے ہیں ـــــ؟

آدھی رات کے بھیانک اندھیرے میں ہم جھندر کی لاش اٹھائے شہر کی فصیل سے لگ کر بہتی ہوئی ندی کے کنارے لے آئے۔ ارادہ تھا کہ اس کو ندی کی لہروں کے حوالے کر دیا جائے لیکن جب دور سے ہمیں وہاں ایک چتا جلتی ہوئی دکھائی دی تو مسرت کے عالم میں مجھے خدا یاد آگیا اور میں کالے آسمان کی طرف دیکھتے ہوے بولا ـــــ "واہ رے خدا ـــــ! آج یقین آیا کہ واقعی تو غریبوں کا بھی خدا ہے"

جب تک اِس چتا کے اطراف لاش کے ورثا، عزیز و اقارب اور تماش بین کھڑے رہے۔ ہم برگد کے پیڑ کے پیچھے چھپے رہے۔ اور جب اس لاش کا آخری وارث بھی چلا گیا تو ہم جھندر کی لاش کو اس شان سے اٹھا لائے جیسے وہ چتا اسی کی لاش کے لیے تیار کی گئی تھی۔

لاش کو چتا پر پھینکنے سے پہلے ہم بڑی دیر تک جھندر کے چہرے کو دیکھتے رہے ہمیں جھندر کی موت پر کوئی افسوس نہیں تھا گر ہماری آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

اور نوح بھرائی ہوئی آواز میں اس کی چھاتی پر سر رکھے وداع کر رہا تھا۔ "پیارے مہندر ——— مہندر تم ہم سے بہت دور جا رہے ہو — مگر ہمیں بھول نہ جانا — زندگی میں تم ہم سے روٹھے ہوئے رہے لیکن اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ——— ہم تمہاری مجبوریوں سے واقف تھے۔ اگر تم سونے اور چاندی کے زیوروں اور ہیرے جواہرات کے آویزوں والی عورت کے جال میں نہ پھنستے تو شاید تم ابھی نہ مرتے ——— نہیں — تم مرے نہیں ہو تمھیں مار دیا گیا۔ سونے اور چاندی کی مالاؤں سے تمھیں پھانسی دی گئی۔ ہیرے جواہرات سے تمہارے دل کو کاٹ ڈالا گیا ——— تم شہید ہو۔ اب ہم تمہاری لاش کو چتا کے غضبناک شعلوں کے حوالے کر رہے ہیں مگر گھبرانا مت ——— یہہ تو ایک چھوٹی سی چتا ہے۔ تم تو زندگی بھر ایک بہت بڑی، راس کماری سے ہمالیہ کے قدموں تک پھیلی ہوئی وسیع و عریض چتا پر جلتے رہے ہو۔ یہہ تو بہت ہی چھوٹی سی چتا ہے اور اس کے شعلے بھی اتنے غضبناک نہیں جتنے کہ سرزمین ہمالہ کی چھاتی سے لپکتے ہوئے خاموش ان دیکھے شعلے گھبراؤ نہیں ——— تم تو بہادر ہو۔ تم نے ہنستے ہوئے جان دی ہے۔

نوح کا لہجہ پھر یکایک بدل گیا۔ اس کی آواز بلند ہو گئی اور وہ جیسے گرجنے لگا۔ "نہیں تم ڈرپوک ہو ——— تم مر گئے ہو۔ تم ہار گئے ہو ——— تم بزدل ہو۔"

مگر ظفر نے اس کو مہندر کے سینے پر سے اٹھا لیا۔ اور پھر ہم دونوں نے اپنے قومی ترانے ——— ع سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا

——— کا پہلا شعر پڑھتے ہوئے لاش چتا کے شعلوں میں پھینک دی ——— اور لاش کے جلنے سے قبل ہی نوح کو سہارا دیکر وہاں سے ہٹ گئے ——— ہندر کی لاش کے جلنے کی بو اُدھر کلکٹر صاحب کی کوٹھی تک آرہی تھی ہم وہاں کھڑے ہو کر بڑی دیر تک وہ بو سونگھتے رہے ——— جیسے وہ بو ہماری پژمردہ روحوں کو حیاتِ تازہ بخش رہی تھی

زندگی کا وقفہ

مہندر کی موت ہمارے لیے کوئی بڑی ٹریجیڈی نہیں تھی ۔ صرف اسی دن جس دن مہندر مر گیا ہمیں موت سے کچھ ڈر محسوس ہو رہا تھا۔ اور وہ بھی اس لیے کہ ہم نے مہندر کی لاش کو اپنی آنکھوں کے آگے بھیانک آگ کے شعلوں میں جلتا دیکھا تھا ـــــ اگر موت بھی ایسے ہی غیر ڈراونے انداز میں آتی جیسے لوگ ریل میں بیٹھ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ چلے جاتے ہیں تو شاید موت سے کوئی بزدل بھی نہ ڈرتا ـــــ اگر ہم آنکھوں سے نہ دیکھتے کہ موت کے بعد انسان کو قبر کے تاریک گڑھوں میں پھینک دیا جاتا ہے آگ کے شعلوں، دریا کی لہروں یا چیلوں اور گدھوں کے حوالے کر دیا جاتا ہے تو عزرائیل کے چہرے میں بھی ہمیں دلاویزی نظر آتی ۔ کیونکہ وہ زندگی سے تو نجات دیدیتا ہے ۔ اور زندگی تو موت سے کئی گنا بھیانک ڈراؤنی اور مکروہ ہے ۔ زندگی میں کیسی کیسی اذیتوں، تکلیفوں اور مظالم کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے ـــــ ؟ موت تو بڑی ہی میٹھی دوامی نیند ہے ۔ اسی لیے مہندر کی موت کے بعد ہمیں بقول نوح صرف ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ہم نے شکسپیر کی کوئی ٹریجیڈی یا راشد الخیری کا کوئی افسانہ ختم کیا ہے ۔

بس۔ صرف ظفر ہی اداس پژمردہ اور بے روح نظر آ رہا تھا۔ جیسے مہندر کی لاش کو چتا پر پھینکتے وقت اس نے اپنی روح بھی چتا کی آگ کے حوالے کر دی تھی۔

ایک دن ظفر نے ہم سے کہدیا کہ میں اب اس دنیا میں صرف چند دنوں اور چند راتوں کا مہمان ہوں۔ اسی لیے میری موت تک کھانے پینے کا بار تم پر ہوگا۔ اب میں موت کے استقبال کے لیے کوئی اہتمام نہیں کروں گا۔ چپ چاپ بستر پر لیٹ کر مر جاؤں گا۔ بستر پر لیٹ کر مرنا بڑی معزز اور شریف موت ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی موت ہوئی کہ جنگ کے میدانوں جنگلوں ہسپتالوں، دریاؤں، سمندروں، ویرانوں میں لاشیں پڑی سڑ رہی ہیں ——— ارے وہ لاش ہی کیا جس پر کسی انسان کا ایک آنسو تک نہ گرے۔ جس کا کفن تک نہ ملے۔ جس کی قبر بھی نہ بنے ——— وہی انسان ایک کامیاب موت مرتا ہے جس کے متعلق لوگ بتا سکیں کہ اس کی قبر فلاں ہے قبر کا وجود انسان کے وجود کو ظاہر کرتا ہے ——— جب تک اس کی قبر دھرتی پر ہے وہ بھی دنیا میں جانا پہچانا جاتا ہے۔ ایسا انسان اصلی بہادر ہوتا ہے جو مر کر بھی اس طرح دنیا نہیں چھوڑتا۔ اس کی قبر زمین کی پیشانی پر زمین کی شکست کا داغ لگا دیتی ہے کہ دنیا کی صعوبتوں نے ہمیں مار ڈالا تو کیا ہوا ہماری ابھری ہوئی قبر دیکھو جو کس شان سے منہ اٹھائے ہوئے ہے اور سچ پوچھو تو موت انھی لوگوں کی زیادہ عزت کرتی ہے۔ وہ ایسے انسانوں کی خوابگاہ میں کیسے ادب و احترام سے دبے دبے قدموں داخل ہوتی ہے۔ کسی کو خبر تک نہیں ہوتی کہ وہ کب آئی۔ کدھر سے آئی۔

اور کدھر چلی گئی ——— مگر یہی موت جنگ کے میدانوں میں لڑنیوالے انسانوں پر کس غضبناک غصیلے طریقے سے حملہ آور ہوتی ہے بندوق کی گولیوں میں دندناتی ہوئی، توپ کے گولوں میں گرجتی ہوئی، تلواروں کی جھنکار میں چنگھاڑتی ہوئی ——— اور پھر حقارت سے انہیں گھاٹیوں، خندقوں، دلدلوں میں پھینک دیتی ہے۔ جہاں چیل کوے گدھ، گیدڑ، لومڑیاں ان کی لاشوں کی تکابوٹی نوچ لیتی ہیں ——— موت ان کی ہڈیاں چبا چبا کر تھوک دیتی ہے۔ مگر جب وہ ہم بستروں پر مرنے والوں کے صحیح وسالم جسموں کا نوالہ بنا کر ہڑپ کر جاتی ہے تو اس کو کتنی لذت محسوس ہوتی ہے۔

نوح نے اس لمبی بات سے اکتا کر کہا "بس ظفر بس ——— تمہارے جملے وہیں تک اچھے تھے جہاں تم نے کہا کہ موت بستر پر مرنیوالے انسانوں کی خوابگاہ میں کس ادب و تعظیم سے دبے دبے قدموں داخل ہوتی ہے۔ اس کے بعد سے تمہارے جملے بھی ناقص ہوگئے اور تخیل بھی ناقص ہوگیا ——— اب تم فضول کمزور بیجان باتیں کر رہے ہو"

ظفر ایک ٹھنڈی سانس لیکر بولا "تمہارا خیال بہت صحیح ہے۔ مجھ میں اب تھوڑی سی جان باقی رہ گئی ہے۔ اور میں اتنی ہی جاندار باتیں کر سکتا ہوں جتنی جان میرے جسم میں باقی ہے۔ باقی باتیں میرے جسم کی طرح کمزور اور پھسپھسی ہو کر رہ جاتی ہیں ——— مگر یہ ہماری ہندوستان میں عوام کی بیماری ہے۔ اس لیے میں اکیلا ہی مورد الزام نہیں۔ اب ہم میں صرف

باتیں کرنے اور تقریریں کرنے کی توانائی رہ گئی ہے ——— باقی رہا عمل ——— یہ ہمارے بس کی بات نہیں ——— ہم تو بس گفتار کے غازی ہیں ——"

نوح اکتا کر اٹھ بیٹھا۔ "کیا قنوطیت پھیلا رہے ہو جی ——— مرنا ہے تو جلد کیوں نہیں مر جاتے ——— ؟ تمہارے ہی جیسے قنوطیوں، معمولی سی معمولی باتوں کو خواہ مخواہ سوچ سوچ کر بڑا بڑا فلسفہ بنا دینے والے بیوقوفوں نے دنیا کو دارالمحن، بیت الالم، دیوانے کا خواب اور جانے کیا کیا بنا دیا ہے ——— یہ تو انسان کی کمینگی ہے کہ اسے جب ہنسی آتی ہے تو وہ دنیا کو بہشت کہہ دیتا ہے اور جب رونا آتا ہے تو چیختا ہے کہ یہ غم خانہ ہے ——— اب مجھی کو دیکھو۔ میں دنیا کو صرف ایک ریستوراں سمجھتا ہوں جہاں ہم کھانے پینے، ہنسنے مسکرانے اور کبھی کبھار ناچ کا ٹکٹ خرید کر وہاں کی نیم برہنہ لڑکیوں کی ٹانگوں، پنڈلیوں اور کمر کے لوچ سے اپنی روح میں گدگدی سی محسوس کرتے ہیں۔ اور زندگی ——— ؟ زندگی ریستوراں کی وہ لڑکی ہے جو سگرٹوں کا خوانچہ اٹھائے عشقیہ انگریزی گانے گاتے ہوئے اپنے خریداروں کو سگرٹ بھی دیتی ہے اور ہلکی سی پُر فن مسکراہٹ بھی ———"

ظفر بستر پر اٹھ بیٹھا اور جیسے باتوں کی رزم تیار ہو گئی۔ "ہونہہ ——— کیا فضول سا تخیل ہے ——— ؟ دنیا اور زندگی کا یہ سستا سا تصور ——— یہ تصور صرف ایک بھوکے انسان کے دماغ ہی میں پیدا ہو سکتا ہے کھانے پینے اور عورت کی مسکراہٹ کے سوا اور بھی تو کام ہیں دنیا میں ———

وہ اعلیٰ و ارفع مقاصد حیات - - - - - - - -

نوح کے دفتر جانے کا وقت قریب تھا اس لیے وہ ظفر کو خاموش کرنے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔ جھندر کی موت کے بعد اس کے گلے سے اُتاری ہوئی نکٹائی باندھتے ہوئے کہنے لگا "ان اعلیٰ و ارفع مقاصد حیات کو اٹھا کر دم ہلانے والے کتوں کے آگے ڈال دو ——— ہم ایسے جھوٹ پسند نہیں کرتے ——— بھئی کس نے کہا ہے یہ شعر ——— ؟

جھوٹی زبان پسند نہ جھوٹا لہو پسند
ہے مجھ کو تیرے میلے دوپٹے کی بُو پسند

یہ کوئی ہنسی کی بات تو نہ تھی لیکن ظفر کو ہنسی آ گئی اور وہ بڑی دیر تک ہنستا رہا جیسے واقعی اس نے جو کچھ کہا ہے وہ سب جھوٹ ہے۔ اور سچائی صرف وہ میلا دوپٹہ ہے جس کی بو سینٹ اور لونڈر کی طرح ناپائدار نہیں ہوتی۔ نکٹائی باندھ کر نوح بڑی دیر تک آئینے میں اپنے آپ کو دیکھتا رہا۔ ہم دونوں اس کو محو جمال خود دیکھتے رہے۔ نوح نے جب ہماری گھورتی ہوئی نظروں کو محسوس کیا تو اپنی جھینپ کو بے تکلفی سے دور کرنے کے لیے پوچھا۔

"کیوں ——— ؟ دل پھینک دیا مجھ پر ——— ؟

میں چاہتا تھا کہ اسے اس سوال کا کوئی جواب نہ دیا جائے۔ تاکہ وہ اور بھی جھینپے اور سٹپٹائے۔ اور سٹپٹا کر کہہ دے کہ بھئی واقعی میں جھینپ گیا لیکن گرتی ہوئی جسمانی صحت کے ساتھ ظفر کی دماغی صحت بھی جواب

دیر ہی تھی۔ اس نے کہہ دیا ''ہاں ہاں ——— واقعی ہم تو مر مٹے کیا کروں کمبخت حافظہ بہت کمزور ہو گیا ہے ورنہ کسی پرانے عاشق مزاج شاعر کا کوئی شعر اس کے ثبوت میں ضرور سنا دیتا''

اب نوح کھسیانے پن سے باہر نکل آیا تھا۔ بولا ''تم عاشق ہو کر کیا کروگے۔ میں تو کسی اور کے لیے ریزر و ہو چکا ہوں''

میں نے تعجب سے پوچھا ''ریزرو ——— !تم بھی ریزرو ہو چکے ہو ——؟ تم نے جھندر کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اب تم بھی اپنی موت کو بلانا چاہتے ہو —— دیکھو پچھتاؤ گے ——— تم نے کچھ دیر پہلے شاید اسی لیے کہا تھا کہ تمھیں دوپٹے کی بو پسند ہے''

نوح مسرت سے کھلا پڑ رہا تھا ''ارے ہٹ —— وہ دوپٹے نہیں پہنتی ہے وہ تو رنگ برنگی فراکیں پہنتی ہے۔ اتنی خوبصورت ہے وہ کہ اس تک پہنچنے کے لیے اگر مجھے موت سے بھی لڑنا پڑے تو تم ٹھوک کر اور اپنی آج صبح ہی صاف کی ہوئی مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر میں تیار ہوں۔ بعد میں پچھتانا بھی پڑے تو کیا حرج ہے ——— !''

ظفر کے منہ میں پانی بھر آیا۔ بھلا کون ہے وہ ——— کیا نام ہے اس کا ——؟

نوح بولا ——— ''بڑا میٹھا نام ہے اس کا —— اگر سننا چاہتے ہو تو پہلے مٹھائی کھلاؤ''

ظفر نے کہا ——— ''یہ تو وہی بات ہوئی کہ ایک بھکاری نے دوسرے بھکاری سے کہا یار آج تو ہی بھیک دیدے''

نوح رعایات و مراعات پر اتر آیا۔" اچھا ادھار ہی ـــــ لیکن بولو کب کھلاؤ گے"۔

میں نے خالص ریاضی کے اصولوں میں مستقبل کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔" ٹھیک اسی دن جس دن ہندوستان کو آزادی مل جائے گی"۔

ظفر بڑا چٹورا تھا۔ گلاب جامنوں اور عورتوں کا نام سن کر تو اس کے منہ سے رال ٹپکنے لگتی۔ وہ چلّا کر بولا۔" نہیں ـــــ یہ فضول سی شرط ہے۔ نہ ہندوستان کو آزادی ملے گی اور نہ ہم مٹھائی کھلائیں گے اسلیے بہتر یہی ہے کہ لڑکی کا نام بھی تم ہی بتاؤ اور مٹھائی بھی تم ہی کھلاؤ"۔

نوح نے ظفر کو ڈانٹا۔" بیوقوف ـــــ ذرا آئینے میں اپنا چہرہ تو دیکھ موت اس قدر قریب آگئی ہے کہ اس کا زرد زرد سایہ تمھارے چہرے پر چھا گیا ہے۔ مگر عورت کی ہوس اب بھی باقی ہے۔ کھانسی سے بار بار ٹھس ٹھس کئے جاتے ہو لیکن گلاب جامنیں کھانے کا بڑا شوق ـــــ تمھیں پتہ بھی ہے۔ جس دن ہم تمھیں ڈاکٹر کے ہاں لے گئے تھے تو اس نے کیا مرض بتایا ـــــ؟

ظفر نے پوچھا۔ کیا مرض بتایا ڈاکٹر نے ـــــ؟

نوح نے مجھ سے پوچھا۔" جلیل ـــــ بتاؤں مرض کا نام ـــــ؟

ڈاکٹر نے ہمیں منع کیا تھا کہ مرض کا نام ظفر کو نہ بتایا جائے لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہا تھا کہ اس کے علاج کیطرف جلد سے جلد توجہ کی جائے ورنہ تلقر کل مرنے والا آج مر جائے گا۔ میں نے سوچا کہ اب اگر ظفر کو مرض کا نام

بتا بھی دیا جائے تو کیا ہرج ہے۔ کیونکہ ہم اس کا علاج تو نہیں کر رہے ہیں۔ اور نہ ایسے مہنگے مرض کے علاج کی ہم میں ہمت ہے —— اسی لیے میں نے ہاں میں سر ہلا دیا۔ نوح ظفر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "دیکھو —— مرض کا نام سن کر تم گھبرا تو نہ جاؤ گے اگر سننا ہی چاہتے ہو تو اپنے نحیف و نزار جسم کی ساری توانائیاں مجتمع کر لو۔"

ظفر نے نوح کو جھڑک دیا "کیا بچوں کی سی بات کرتے ہو۔ زندگی سے بڑا بھی اور کوئی مرض ہے —— ؟ میں اس سے نہیں ڈرتا تو تمہارے اسٹھسکوپ لگا کر فیس وصول کرنے والے ڈاکٹروں کے بتائے ہوئے امراض سے ڈروں گا۔ ہونہہ —— !"

نوح بولا —— تو پھر سن لو —— تمہیں دق ہو گئی ہے۔ اور دوسرا درجہ بھی شروع ہو چکا ہے۔"

ظفر کے چہرے پر ایک شکن بھی نہ ابھری "دق —— ! ہونہہ —— یہ کوئی مرض نہیں اور اگر مرض ہے تو بڑا رومانوی قسم کا مرض۔ دق تو عشق کی بہن معلوم ہوتی ہے۔

تمہیں مذاق سوجھا" جی —— بہن نہیں۔ دادی ہے دادی !

ظفر کو نجریہ جملے انگریزی میں بولنے کی بڑی بُرائی عادت تھی اس نے کہا اوہ ڈیش اٹ —— آئی کیر اے فگ

ہٹاؤ بھی۔ مجھے اس کی ایک انجیر برابر بھی پروا نہیں۔

نوح ہنس پڑا "چٹورا کہیں کا ——— تم دیکھ رہے ہو جلیل۔ اس کے جملوں میں انجیر وغیرہ لگ جاتے ہیں۔"

ظفر نے مسکرا کر کہا ——— "ابے وہ تو ایک محاورہ ہے۔"

نوح بولا ——— اور ایسے محاورے تو مجھے بہت آسانی سے یاد ہو جاتے ہیں اور ہمیشہ یاد رہتے ہیں۔

ظفر کی مسکراہٹ اب ہنسی میں بدل گئی "تو تم ہی بتاؤ کہ پھر کیا کروں ——— بڑی دیر سے اس عورت کا نام سننے کے لیے تڑپ رہا ہوں تم بتاتے نہیں اسی لیے ذرا زبان کا ذائقہ بدلنے کے لیے انجیر سے لدا ہوا محاورہ استعمال کیا۔"

میں نے بھی ظفر کی تائید کی "ہاں یار ——— اس عورت کا نام سنا دو۔ اور دیکھو اگر کوئی عورت تمھاری محبوبہ نہ بھی ہو تب بھی کسی فرضی محبوبہ کا نام سنا سکتے ہو۔ اس مکان کی فضا میں عرصہ سے کسی عورت کا نام نہیں گونجا ہے۔ اسی لیے یہاں کی فضا کچھ اداس اور بوجھل سی ہو گئی ہے۔"

نوح چڑ گیا ——— "کیا کہا ——— فرضی نام بتا دوں۔ میں کوئی غزل گو شاعر تو ہوں نہیں جس کی محبوبہ کا نام دفتر مردم شماری میں بھی نہیں ملتا۔ میں ان پرانے شاعروں کی طرح نہ فارغ البال ہوں اور نہ ان کی طرح بلانوش شرابی ——— میں ان کارٹونی معشوقوں کا دلدادہ نہیں ہوں جن کا قد سرو جتنا لمبا ہے۔ ابروؤں کی جگہ کمانیں گیسوؤں کی

بتا بھی دیا جائے تو کیا ہرج ہے۔ کیونکہ ہم اس کا علاج تو نہیں کر رہے ہیں۔ اور نہ ایسے مہنگے مرض کے علاج کی ہم میں ہمّت ہے —— اسی لیے میں نے ہاں میں سر ہلا دیا۔ نوح ظفر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "دیکھو —— مرض کا نام سن کر تم گھبرا تو نہ جاؤ گے اگر سننا ہی چاہتے ہو تو اپنے نحیف و نزار جسم کی ساری توانائیں مجتمع کر لو۔"

ظفر نے نوح کو جھڑک دیا "کیا بچوں کی سی بات کرتے ہو۔ زندگی سے بڑا بھی اور کوئی مرض ہے —— ؟ میں اس سے نہیں ڈرتا تو تمھارے اسٹھسکوپ لگا کر فیس وصول کرنے والے ڈاکٹروں کے بتائے ہوئے امراض سے ڈروں گا۔ ہونہہ —— !"

نوح بولا —— تو پھر سُن لو —— تمھیں دق ہو گئی ہے۔ اور دوسرا درجہ بھی شروع ہو چکا ہے۔"

ظفر کے چہرے پر ایک شکن بھی نہ اُبھری "دق —— ! ہونہہ — یہ کوئی مرض نہیں اور اگر مرض ہے تو بڑا رومانوی قسم کا مرض۔ دق تو عشق کی بہن معلوم ہوتی ہے۔

تجھے مذاق سوجھا "جی —— بہن نہیں۔ دادی ہے دادی!

ظفر کو نحر یہ جملے انگریزی میں بولنے کی بڑی پرانی عادت تھی اسنے کہا اوہ ڈیش اٹ —— آئی کیر اے فگ

ہٹاؤ بھی۔ مجھے اس کی ایک انجیر برابر بھی پروا نہیں۔

نوح ہنس پڑا "چٹورا کہیں کا ——— تم دیکھ رہے ہو جلیل۔ اس کے جملوں میں انجیر وغیرہ لگ جاتے ہیں"۔

ظفر نے مسکرا کر کہا ——" ابے وہ تو ایک محاورہ ہے"۔

نوح بولا ——— اور ایسے محاورے تو مجھے بہت آسانی سے یاد ہو جاتے ہیں اور ہمیشہ یاد رہتے ہیں۔

ظفر کی مسکراہٹ اب ہنسی میں بدل گئی "تو تم ہی بتاؤ کہ پھر کیا کرد ——— بڑی دیر سے اس عورت کا نام سننے کے لیے تڑپ رہا ہوں تم بتاتے نہیں اسی لیے ذرا زبان کا ذائقہ بدلنے کے لیے انجیر سے لدا ہوا محاورہ استعمال کیا"۔

میں نے بھی ظفر کی تائید کی "ہاں یار ——— اس عورت کا نام سنا دو۔ اور دیکھو اگر کوئی عورت تمھاری محبوبہ نہ بھی ہو تب بھی کسی فرضی محبوبہ کا نام سنا سکتے ہو۔ اس مکان کی فضا میں عرصہ سے کسی عورت کا نام نہیں گونجا ہے۔ اسی لیے یہاں کی فضا کچھ اداس اور بوجھل سی ہو گئی ہے"۔

نوح چڑ گیا ——" کیا کہا ——— فرضی نام بتا دوں۔ میں کوئی غزل گو شاعر تو ہوں نہیں جس کی محبوبہ کا نام دفتر مردم شماری میں بھی نہیں ملتا۔ میں ان پرانے شاعروں کی طرح نہ فارغ البال ہوں اور نہ ان کی طرح بلانوش شرابی ——— میں ان کارٹونی معشوقوں کا دلدادہ نہیں ہوں جن کا قد سرو جتنا لمبا ہے۔ ابروؤں کی جگہ کمانیں گیسوؤں کی

جگہ ناگنیں ـــــــ ایسی خطرناک معشوقہ کے ساتھ ایک دن بھی زندہ نہ رہ سکوں گا۔ سنا ہے کہ ایسے معشوق کی کمر ہی نہیں ہوتی بھلا وہ معشوق بھی کوئی معشوق ہے جس کی کمر ہی نہیں ہیں تو بغیر کمر کے معشوق کو معشوق ہی نہیں سمجھتا۔ معشوق کی تو کمر ہونی نہایت ضروری ہے تاکہ باہیں اس کے گرد حمائل کر کے اپنی زندگی کے لوچ لچک اور گداز کو محسوس کر سکیں۔ میرے معشوق کی کمر تو بڑی ہی گداز ہے۔ اس کی ابروں کی جگہ ابروئیں ہی ہیں۔

دوستو! میں جس دنیا میں رہتا ہوں وہ اسی دنیا کی عورت ہے وہ اتنی خوبصورت بھی نہیں۔ اس کی زلفیں لمبی بھی نہیں۔ جہاں اس کی زلفیں لمبی ہوتی ہیں وہ کسی ہیر کٹنگ سیلون میں اپنی ناگنوں کی ہر زبانیں زرشو الیتی ہے۔

ظفر بسورتے ہوئے بولا "یار نوح ـــــــ دیکھو میں دق میں مبتلا ہوں۔ دوسرا درجہ شروع ہو چکا ہے اگر تم نے اس لڑکی کا نام نہ بتایا تو مجھے یقین ہے کہ دق کا تیسرا درجہ بھی شروع ہو جائے گا اور میں مر جاؤں گا۔ اس وقت اگر میری روح اس عورت کا نام جاننے کے لیے تمھیں ستایا کرے تو میری روح کو برا بھلا نہ کہنا ـــــــ"

نوح اور میں ہنس پڑے۔ میں نے کہا "ابھی دھونس جما رہے ہو۔ مگر محبوبہ تو نوح کی ہے۔ تم نام جان کر کیا کرو گے ـــــــ؟"

ظفر نے اپنی بزرگی جتانی چاہی "تم ابھی بچے ہو۔ تم انسانی نفسیات کو کیا جانو۔ تم عورت کو صرف عورت سمجھتے ہو مگر میں عورت کو عورت

سے بھی زیادہ وسیع سمجھتا ہوں۔ عورت اتنی ہی وسیع اور لامحدود ہوتی ہے جتنا کہ اس کا حُسن۔

میں ظفر کی اس بزرگانہ حماقت پر جھلا اٹھا" سالے ——— تم میں کبھی کبھی بورژوائیت جاگ اٹھتی ہے۔ تم اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہو ———؟ بی۔اے میں تمہارے مضامین اختیاری معاشیات اور فارسی تھے اور اتنے سہل مضامین میں تم چار سال فیل ہوتے رہے اور اب انسانی نفسیات کے ماہر بن بیٹھے ہو ——— تم جتنی نفسیات جانتے ہو اتنی بلکہ اس سے بھی زیادہ میں جانتا ہوں۔ کیونکہ میرے مضامین اختیاری فلسفہ اور منطق تھے۔

ظفر جیسے مُرغے کی ایک ٹانگ بنا ہوا تھا" اس سے کیا ہوتا ہے کتابیں پڑھنا اور ہے دنیا کو دیکھنا اور سمجھنا اور ہے۔"

میں ضد کرنے لگا" نہیں۔ تم پہلے اپنی بے ڈھنگی نفسیات سمجھاؤ کہ کسی کی محبوبہ کا نام سن کر تم پر کیا نفسیاتی اثر پڑے گا۔"

وہ ابھی تک اپنے آپ کو ماہر نفسیات سمجھ رہا تھا" دیکھو۔ تم ناراض مت ہو یہ نفسیاتی باریکیاں جِل پریوں کی کہانیاں تو ہیں نہیں کہ یوں کہی جائیں اور یوں سمجھ میں آجائیں ——— ان کو سمجھنے کے لیے ہمہ تن دماغ ہونا پڑتا ہے۔

توحید نے اپنی نکٹائی کی گرہ مضبوط کرتے ہوئے کہا" تم دونوں اسی طرح لڑتے رہو۔ مجھے دفتر کو دیر ہو رہی ہے۔ میں تو جا رہا ہوں۔ اور دیکھو اگر لڑائی باتوں سے طے نہ ہو تو اندر کے کمرے سے ہاکی اسٹک نکال لینا۔ میں اس مکان کی زمین کو تم میں سے کسی ایک کے خون سے سُرخ دیکھنا چاہتا ہوں۔"

ظفر نے نوح کو پکار کر روکنا چاہا لیکن نوح اس بازاری عورت کی طرح ٹھینگا دکھاتا ہوا باہر چلا گیا جو اچانک ظفر کی چوٹی کے جواب میں ایسا ہی ٹھینگا دکھا گئی تھی۔ نوح کے دروازے سے باہر نکل جانے کے بعد ظفر اپنی نفسیات و نسیات سے بچے ل گیا اور اپنی ٹھوڑی کو اپنی انگلیوں پر سہارا دیتے ہوئے بڑبڑانے لگا۔

"اس نے عورت کا نام نہیں بتایا اور مجھے دوسرے درجے پر پہنچی ہوئی دق ہے۔ ایسی حالت میں عورت کے نام ضرور سننے چاہئیں۔ خوبصورت عورتوں کے پیارے پیارے نام سننے سے زندگی بڑھتی ہے ——— میں جانتا ہوں۔ میں نے بہت سے ایسے لوگوں کو دیکھا ہے جو عین سکرات کے عالم میں اپنی محبوباؤں کا نام سُن کر ہوش میں آگئے ہیں۔ مرتے مرتے ان کے چہروں کو دیکھ کر از سرِ نو زندہ ہو گئے ہیں۔"

مجھے اس وقت اپنی غلطی محسوس ہوئی کہ نفسیات سے واقف ہونے کے لیے فلسفہ کا مضمون اختیاری ہونا کوئی ضروری نہیں۔ زندگی سب کچھ سکھا دیتی ہے۔ زندگی ہی سب سے بڑی معلم ہے۔ انسان یونیورسٹی سے اتنا زیادہ نہیں سیکھتا جتنا زندگی سے سیکھتا ہے۔ یونیورسٹی تو صرف کلرک بناتی ہے۔ لیکن زندگی انسان بناتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ سوچتے سوچتے میں نے ایسا محسوس کیا جیسے میں کسی پنڈال میں اسٹیج پر کھڑا مائیکروفون کے سامنے چیخ رہا ہوں اور میرے سامنے آنیوالی نسل کا ایک ایک فرد کھڑا میری تقریر سن رہا ہے۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان تمام راستوں کے رُخ بدل دو جو کالجوں اور

یونیورسیٹوں کی طرف جاتے ہیں۔ زندگی کو اگر سمجھنا ہے اور سیکھنا ہے تو زندگی
ہی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر دیکھو ——— میں ہندوستانی ہوں اور
ہندوستان ہی کی باتیں کروں گا۔ مجھے دوسرے ملکوں کے طرز تعلیم سے
محبت نہیں۔ میں اپنی بات کروں گا۔ بتاؤ۔ اے نوجوان دوستو۔ یونیورسیٹو
میں ہمیں "میرا دل ہائی لینڈ میں ہے"۔ والی نظم پڑھائی جاتی ہے بھلا ایک
ہندوستانی کا دل ہائی لینڈ میں کیسے ہو سکتا ہے۔ ہمیں یہہ کیوں نہیں رٹا یا
جاتا کہ میرا دل کشمیر میں ہے۔ میرا دل لاہور میں ہے۔ میرا دل دلی میں ہے۔ میرا
دل آگرہ میں ہے۔ میرا دل بمبئی میں ہے۔ میرا دل مدراس میں ہے۔ میرا دل
حیدرآباد میں ہے ——— یہہ کیوں نہیں۔ ؟ ملٹن کی فردوس گم گشتہ سے
ہمیں کیا واسطہ جبکہ ہماری کھویا ہوا فردوس ہمیں واپس نہیں ملتا۔ انگلستان
کی چڑیوں، کوئیلوں، پھولوں، جھیلوں اور پہاڑوں پر نظمیں پڑھ کر آخر ہم
کیا کریں۔ نیلسن اور واشنگٹن کے قصے سنا کر ہمیں کیوں مرعوب کرایا جاتا ہے۔
ولیم فاتح ملکہ الزبتھ اور وکٹوریہ کے درباروں کی عظمت کیوں دکھائی جاتی
ہے ——— ؟ ہماری ذہنی صلاحیتوں کو آدھی آدھی عمر تک انگریزی
سیکھنے کی کوشش میں کیوں تباہ کیا جاتا ہے۔ ہماری قومی زبان میں ہمیں تعلیم
کیوں نہیں دیجاتی ——— ؟ میں نے انگریزوں کو بھی دیکھا ہے جو بارہ بارہ
برس دہلی میں رہکر "تم" کو "ٹم" کہتے ہیں۔ وہ لوگ اردو کیوں نہیں سیکھتے اور
ہم انگریزی کیوں سیکھتے ہیں ——— ؟
میں پہلی جماعت سے بی۔ اے تک پورے چودہ سال انگریزی سیکھتا رہا

لیکن اب بھی میں انگریزی کے دو جملے صحیح نہیں بول سکتا۔ کل ہی جب محلے کا ایک بیروزگار لونڈا شاہی بحریہ میں بھرتی ہونے کے لیے درخواست لکھوانے آیا تھا تو مجھے اس نوٹ بک سے مدد لینی پڑی جس میں انگریزی میں درخواست لکھنے کے طریقے اور اچھے اچھے جملے میں نے لکھ رکھے ہیں۔ میں گریجویٹ ہوں!

ایک بار ایک امریکن سیاح لیڈی آگرے میں تاج محل دیکھتے ہوئے۔ جب ہندوستان سے متعلق مجھ سے باتیں کرنے لگی تو میری زبان لڑکھڑانے لگی۔ میں غلط سلط جملے بولنے لگے۔ انگریزی تو انگریزی اب میں اپنی مادری زبان بھی بھولنے لگا ہوں۔ یونیورسٹی سے واپس ہونے کے بعد جب میرے والد میرے مذاق کے مطابق باتیں کرنے کے لیے کانگرس اور مسلم لیگ پر باتیں کرتے تو میری گفتگو میں از خود بہت سے انگریزی الفاظ آجایا کرتے تھے۔ میرے گلستاں بوستاں کے متعلم باپ کو میری گفتگو سمجھنے میں بڑی دقت ہوتی تھی۔ ایک بار میں نے بار بار ان کے سامنے کمیونل فیلنگس کے لفظ استعمال کیے۔ انھوں نے پوچھا کہ یہ کیا بلا ہے کمیونل فیلنگس ——؟ حافظہ پر بڑا زور دینے کے بعد میں نے کمیونل فیلنگس کے معنی انھیں سمجھائے تھے مجھے ایک اور واقعہ یہاں یاد آتا ہے میں شاید نویں کلاس میں پڑھتا تھا۔ میرے انگریزی کے استاد کی شکل بڑی مضحکہ خیز تھی لیکن وہ محض اس لیے نہیں ستائے جاتے تھے کہ انگریزی پڑھاتے تھے۔ انگریزی پڑھانے والے استاد سے انگریزی زبان میں مذاق ضروری ہے۔ یہاں انگریزی میں ایک جملہ تک صحیح نہیں بولنا آتا تھا۔ مذاق کیسے کیا جاتا —— میں ان کو ستانے کی کوشش

ضرور کرتا لیکن ان پر کسنے کے لیے جملے بناتے بناتے چالیس منٹ کا گھنٹہ یوں ہی گزر جاتا۔ ولایت بھی ہو آئے تھے۔ انھوں نے ایک بار شیلے کی نظم انگلستان ۱۸۱۹ء میں بقول ان کے "بائی ہارٹ" کرنے کا حکم دیا ——— مجھے طیش آگیا اور میں نے یاد نہیں کی۔ وہ مجھے ہر روز بید لگاتے اور میں کبھی نہ یاد کرتا۔ ایک دن انھوں نے سبب پوچھا۔ میں نے جواب دیا۔ میں نے سروجنی کی نظم "دی امپیریل دہلی" یاد کی ہے۔ آپ وہ سن لیجئے۔ انگلستان ۱۸۱۹ء میں کیسا تھا یہ جاننے کی آخر مجھے ضرورت ہی کیا ہے ——— ؟"

استاد ولایت سے بڑے سمجھدار ہو کر لوٹے تھے یعنی ولایت میں اپنے کالے رنگ اور ہندستانی خط و خال کی وجہ سے کافی ذلیل اور ہزیمتیں اٹھا چکے تھے چپ ہو گئے بعد میں میری تعریف کی۔ مگر مجھے ستائش کی تمنا نہیں۔ میرے دل میں ایک جوالا مکھی پھوٹنے والا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ جوالا مکھی جلد ہی پھوٹے اور سارے ہندستان کو لاوے کے سمندر میں ڈبو دے! اور پھر ایک آگ سے پاک کیا ہوا صاف شفاف پاک دیوتر ہندستان دھرتی پر ابھر آئے ———

اچانک میں نے ایسا محسوس کیا جیسے میرے سامنے جمع ہونے والے نئی نسل کے تمام افراد قہقہے مار مار کر ہنس رہے ہیں اور مجھے پاگل دیوانہ خبطی کہہ رہے ہیں ....

میں اب اپنے آپ میں واپس آچکا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ظفر قہقہے مار مار ہنس رہا ہے اور مجھے پاگل دیوانہ خبطی کہہ رہا ہے۔ میں تصوّر ہی تصور میں جذبات بھری ہوئی پر جوش تقریر کر رہا تھا۔ میرے چہرے پر عجیب مضحکہ خیز اتار چڑھاؤ پیدا ہو رہا تھا۔ اور یہ منظر ظفر کو قہقہے مار مار کر ہنسنے پر مجبور کر رہا تھا۔

مجلہ عروسی کی طرف

شام کو نوح جب دفتر سے واپس ہوا تو ظفر پھر اس کے سر ہو گیا کہ اپنی محبوبہ کا نام بتاؤ۔ نوح شاید اب تک اس مغالطہ میں تھا کہ صبح ظفر صرف اس کو چھیڑنے اور ستانے کے لیے اس کی محبوبہ کا نام پوچھ رہا تھا لیکن پورے دس گھنٹے گزر جانے کے بعد ظفر کے نام جاننے کے اصرار پر اس نے کچھ متعجب اور کچھ مشکوک نظروں سے میری طرف دیکھا لیکن میں نے اس کو جلد ہی سمجھا دیا کہ ظفر دق کا نفسیاتی علاج کر رہا ہے۔ نوح نے ظفر کو جواباً چھیڑنے کے لیے کہا۔ بیٹا ــــــ تم اب زندہ نہیں رہ سکتے۔ خواہ مخواہ ہی جینے کی کوشش نہ کرو۔ اگر تم کہو تو اس نئی نکٹائی سے تمھارا گلا گھونٹ دوں تاکہ تم بآسانی مر جاؤ۔ یہ کہتے ہوئے نوح نے اپنی جیب سے ایک نئی نکٹائی نکالی اور فخریہ انداز میں دکھاتے ہوئے کہنے لگا وہ بھئی۔ انگریزوں نے بھی مردوں کے لیے کیا زیور بنایا ہے۔ واہ واہ۔"

ظفر نے جیسے کوئی بڑی انوکھی بات کہہ دی ہو " اماں مرد بھی کہیں زیور پہنتے ہیں۔ ارے مرد کا زیور تو بس تلوار یا کوئی اور ہتھیار ہوتا ہے ــــ"

نوح نے جواب دیا۔ تم بھی کس زمانے کی باتیں کر رہے ہو۔ بھوک

بھلانے کے لیے، شکار کھیلنے کے لیے، دشمن سے بچنے کے لیے، ملک فتح کرنے کے لیے اور عورتوں کا اغوا کرنے کے لیے ہتیار کی ضرورت تھی۔ اب تو چاندی کا ایک گول گول چمکدار ٹکڑا بھوک بجھا سکتا ہے۔ دشمن کو تباہ کر سکتا ہے۔ ممالک فتح کر سکتا ہے۔ عورتوں کو خرید سکتا ہے۔ پھر تلوار یا ہتیار کی کیا ضرورت ــــ؟

ظفر اپنی بات پر ابتک اڑا ہوا تھا۔ "نہیں ـــــ یہ بیہودہ بکواس ہے اور تمھاری بکواس کے باوجود تلوار مرد کا زیور ہے۔ بلکہ میں کہوں گا کہ وہ مرد مرد ہی نہیں جس کی کمر میں تلوار نہ بندھی ہو۔"

نوح نے بات کا رُخ مذاق کی طرف پھیرنے کے لیے کہا۔ "بھئی ــــ آج کل تو صرف جلادوں کی کمر میں تلوار بندھی ہوتی ہے۔ یعنی اب دنیا میں صرف جلاد یا ہٹلر مسولینی اور ٹوجو ہی مرد رہ گئے ہیں اور باقی سب ـ ـ ـ ـ ـ ـ اور اس نے پوچھا۔ "بتاؤ ــــ ان سب کو کیا نام دیا جائے۔"

ظفر نے ایک دم بات بدل دی۔ "اگر اپنے ملک کو آزاد کرانا چاہتے ہو تو پہلے بکتائی کے پھندے سے اپنے آپ کو آزاد کر لو ــــ شمشیر بہ کمر آؤ۔" میں نے بھی ظفر کی طرف سے نوح پر ایک چوٹ کی۔ "ابے جب ــــ یہاں ایک نمک حلال کلرک بیٹھا ہے۔ جا کے اپنے آقا سے کہدے گا تو سینٹوریم کے گدیلے بستر پر مرنے کے بجائے جیل میں چکی پیستے پیستے مر جائے گا۔"

یہ چوٹ نوح کے دل پر پڑی اور ایک گہری آہ اس کے سینے سے

نکلی لیکن ظفر نے پھر ایک جملہ کس دیا "ہاں بھئی ـــ غلامی کے نئے نئے پھندے چودہ چودہ آنے میں خرید کرلائے جا رہے ہیں۔"

نوح چڑکر بولا "یہہ کلر کی یا غلامی کا پھندا نہیں۔ ارے یہہ تو عشق کا پھندا ہے۔"

ہم دونوں کے منہ میں جیسے ایک ہی زبان ہلی ـ "اوہ!"

نوح نے اکڑ کر کہا ہمارے دفتر میں ایک اسٹینو ٹائپسٹ ہے۔

"مس ریتا کارلائیل ـــ آہا! سوئیٹ ـــ سارے دفتر میں وہ کسی سے مسکرا کر بات نہیں کرتی لیکن جب یار نوح پہنچ جاتے ہیں تو بار بار ہونٹوں پر سُرخی لگا لگا کر آئینہ دیکھ دیکھ کر مسکرا کر گھنٹوں باتیں کرتی رہتی ہے۔"

رجعت پسند ظفر بولا "مجھے ان عورتوں کی نہ محبت پر بھروسہ ہے نہ نفرت پر اعتماد۔"

نوح نے اس لڑکی کی تعریف کرتے ہوئے جواب دیا "نہیں یار ـــ وہ اس طبقے کی عام لڑکیوں کی طرح دوغلی نہیں ہے وہ پیدائشی کرسچین ہے۔ کنورٹیڈ نہیں ـــ!"

ظفر نے کہا "اور اسی لیے وہ تمہارے گلے میں نکٹائی کو دیکھنا بہت ضروری سمجھتی ہے اور جس دن تمہارے گلے میں نکٹائی نہ ہو گی اس کو تم نے کسی دوسرے ۱۸۵۷ء کا خدشہ پیدا ہو جائے گا۔"

نوح نے بالکل صاف بات کہدی "دیکھو بھئی ـــ ہم محبت کے

سرے سے قائل ہی نہیں ۔ ہم نے مہندر کی محبت کا انجام بھی دیکھا اور ظفر کی محبت کا بھی ——— ہمارا تو یہہ نظریہ ہے کہ محبت سوائے جنسی تعلقات کے اور کچھ نہیں ——"

ظفر نے ایک بار اس کی تائید میں ہیولاک ایلس کا حوالہ دینا شروع کیا۔ "جب تک عورت میں جنسی تلذذ ہے۔ اس کی محبت بھی جنسی تلذذ ہے۔ میں اب عورت سے اتنا غیر مطمئن ہو گیا ہوں کہ اس کی ہر حرکت کو جنسی تلذذ کا مظاہرہ سمجھتا ہوں ۔ اس کا حسن، اس کی موسیقی، اس کا رقص، اس کا بوسہ اس کی نظریں، اس کا لمس، اس کا لباس سب کچھ جنسی تلذذ ہے۔

ابھی ہم یہہ گفتگو کر ہی رہے تھے کہ دروازہ پر بڑی زور کی دستک ہوئی ہم تینوں کے منہ سے ایک چیخ نکلی ——— منی آرڈر ——— !"
نوح ایک زقند بھر کر دروازے تک گیا۔ اور جب دروازہ کھولا تو فوراً ہی پلٹ کر اونچی سانسوں میں پکارا۔
ارے ——— ابا آ گئے ——— ابا۔ سگریٹ کی ڈبیاں اور ایکٹرسوں کی تصویریں چھپا دو ——— جلدی ۔"

ہم جلد جلد اس کے بتائے ہوئے کاموں میں مشغول ہو گئے اور ایک لمبی کھانسی کے کھٹر کھٹر کرتے ہوئے ایک دراز قد سپید بالوں والے بزرگ سپید اچکن اور سرخ ترکی ٹوپی پہنے اندر داخل ہوئے۔ اور ہم نے نہایت مودبانہ طریقے پر انہیں سلام کیا۔ اور جب انھوں نے ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کیا تو ہم اسی پرتکلف انداز میں بیٹھ گئے جیسے مارسڈن کی تاریخ ہند میں ٹھگوں کا ایک

گروپ بیٹھا ہوا ہے۔

تھوڑی دیر بعد ہم تینوں نوح کے ابا کی خدمت گزاری میں مصروف ہو گئے۔ میں نے ان کے منہ دھونے کے لیے نل کے پاس لوٹے میں پانی رکھ دیا ظفر نے ان کا ناشتہ دان کھول کر دستر خوان پر کھانا چن دیا اور نوح نے ان کا ٹرنک اور ہولڈال اندر کے کمرے میں رکھ دیا۔ میں نے اور ظفر نے پہلی بار نوح کے ابا کو دیکھا تھا۔ بڑا شفقت آمیز بڑھاپا تھا۔ ان کے لمبے قد، مضبوط قویٰ، گندمی رنگ اور کامریڈ اسٹالین جیسی گھنی گھنی مونچھوں سے بڑا وقار اور دبدبہ ٹپک رہا تھا۔ بڑی بڑی ذرا ذرا دھندلائی ہوئی آنکھوں میں سکون، اطمینان اور مستقل مزاجی کی بڑی واضح جھلک تھی۔

ناشتہ کرنے کے بعد نوح نے بڑے مودب طریقے سے میرا اور ظفر کا تعارف کروایا۔ وہ شاید تعارف کی ضرورت محسوس نہیں کر رہے تھے اس لیے چپ رہے۔ البتہ جیب سے پان کی ڈبیا نکال کر ہمارے آگے سرکا دی۔ ہم نے انکار کر دیا لیکن ان کے اصرار پر مجبوراً میں نے اور ظفر نے ایک ایک پان اٹھا لیا۔ پان چباتے ہوئے انھوں نے میری طرف دیکھا اور فرمانے لگے —

آپ انگریزی پڑھے لکھے نوجوانوں سے تو ہم جاہل ہی بھلے۔ ہم نے صرف گلستان بوستان پڑھی تھی اور بڑے ٹھاٹھ سے چالیس برس تحصیلداری کی اور ان آپ کے دوست نوح نے بی۔ اے کامیاب کرنے کے بعد تیس روپے کی کلرکی قبول کر لی ہے۔"

اس وقت میں چاہتا تھا کہ قبلہ سے ذرا سوچو۔ وہ نظام تعلیم پر خوب

بحث کروں لیکن سوچا کہ اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ۔۔۔۔۔ اس لیے اپنے جواب کو بہت ہی مختصر اور تن سے دور کرتے ہوئے یوں ادا کیا "ہاں قبلہ ـــــ زمانہ ہی ایسا ہے اور مجبوری سب کچھ کرواتی ہے۔"

نوح کے اباگاؤ تکیے سے نیم دراز لیٹے تھے میرا جواب سن کر جیسے لیٹ نہ سکے اٹھ بیٹھے اور کہنے لگے "زمانہ ایسا ہے نہ مجبوری ایسا کراتی ہے بلکہ آپ لوگ بزدل ہیں۔ پست ہمت ہیں۔"

ہم تینوں اس غیر متوقع اور مسکت جواب سے چونک پڑے۔ ایک دوسرے کے چہرے دیکھنے لگے۔ ہمارا خیال غلط تھا کہ اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو ـــــ چالیس برس غلامی کرنے کے بعد اور بڑھاپے کے انحطاطی دور میں بھی ایسا تیز ایسا غیر متوقع اور ایسا جوان جواب ـــــ میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں نوح کی ہنستی ہوئی آنکھوں کو سنایا کہ ـــــ خدا کرے کہ ہندوستان کے سب باپ تیرے باپ ایسے ہو جائیں ـــ اسی اثناء میں وہ پان کی پیک تھوکنے دالان کی سیڑھیوں تک گئے تو ظفر سے نہ رہا گیا اور اس نے نوح کی ران میں چٹکی لیتے ہوئے کہا "یار ـــــ یہ تو بڑا فارورڈ (FORWARD) بڈھا ہے ـــ انتہائی ترقی پسند ـــــ واللہ۔

پیک تھوک کر وہ پھر آ بیٹھے اور اپنی گفتگو جاری رکھی "اب یہ نوح سے کس نے کہا تھا کہ وہ کلرکی قبول کریں۔ کلرکی کے بجائے وہ بیکار ہی رہتے تو مجھے کوئی افسوس نہ ہوتا۔

ظفر عادتاً ان سے بے تکلف ہو گیا "قبلہ —— گستاخی معاف آپ نے تحصیلداری کیوں کی۔ کلرکی بھی غلامی ہے اور تحصیلداری بھی غلامی ——"

وہ مسکرائے اور فرمانے لگے "آپ سچ کہتے ہیں جناب —— آپ کا نام —— ؟"

ظفر بڑے ادب سے لیکن مسکراتے ہوئے بولا "جی مجھے ظفر کہتے ہیں"۔

انھوں نے گاؤ تکیہ پر پھر سے نیم دراز ہوتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ظفر صاحب —— آپ کا کہنا سچ ہے لیکن آپ ہی سوچئے کہ میرے چار بچے اور ایک بیوی ہے۔ میں نوکری نہ کرتا پھر کیا کرتا۔ میرے باپ سپاہی تھے۔ میرے دادا سپاہی تھے۔ وہ میرے لیے کچھ جائداد چھوڑ گئے ہوتے تو میں نوکری کبھی نہ کرتا۔ مگر میں پوچھوں یہ آپ کے دوست نوح صاحب کو آخر ایسی کیا پڑی تھی کہ انھوں نے تیس روپے کی ذلیل نوکری قبول کر لی۔ ان کے بیوی ہے اور نہ بچہ —— اور ابھی تو میں زندہ ہوں"۔

ظفر نے نوح کی تعریف کی خاطر کہہ دیا "قبلہ نوح تو اشتراکی ہے۔ وہ موروثی جائداد کا قائل نہیں"۔

نوح کے ابا اس پھسپھسی دلیل کو کب ماننے والے تھے۔ بولے "نوح موروثی جائداد کے قائل نہیں لیکن غلامی کے ضرور قائل ہیں —— کیوں —— ؟ میں اشتراکیت کے متعلق زیادہ تو نہیں جانتا البتہ تھوڑا بہت اخباروں سے میں نے پڑھا ہے۔ یہ تحریک اچھی ہے یا بری۔ اس سے مجھے بحث نہیں لیکن

میرا خیال ہے کہ آپ ہی جیسے نیم ریاں دماغ اور ناتجربہ کار غیر مستقل مزاج نوجوانوں نے اپنی بے سوچی سمجھی حرکتوں سے اس تحریک کو بدنام کر دیا ہے۔"
ظفر نے جھٹ سے قبلہ کی تعریف کر دی "قبلہ —— آپ کا مطالعہ تو بہت وسیع ہے۔"

قبلہ ان تعریفوں میں جلد ہی آجانے والے نہ تھے "اجی مطالعہ وطالعہ کا ہیکا —— ہم صرف اپنی آنکھیں کھلی رکھ کر ہر چیز کو دیکھتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں اور آپ انھی چیزوں کو کتابوں سے دیکھتے اور سمجھتے ہیں اس لیے آپ ان چیزوں تک بالراست نہیں پہنچ سکتے ——"

اگر نوح کے ابا بزرگ نہ ہوتے تو میں "یونیورسٹی ایجوکیشن مردہ باد" کا نعرہ لگاتا ہوا ان سے لپٹ جاتا —— اس کے باوجود میں نے بے خودی میں کہہ دیا —— واہ کیا جوتا مارا آپ نے ——؟"

لیکن پھر ان کی سپید مونچھوں اور بزرگی کی پھیلی ہوئی جھریوں کو دیکھتے ہوئے محسوس کرتے ہوئے کہا "قبلہ — بہت ٹھیک کہا آپ نے۔"

قبلہ اب مسرت سے کھلے نظر آرہے تھے۔ کیونکہ انھوں نے صرف گلستاں اور بوستاں پڑھ کر ہندوستان کی ایک بہت بڑی مشہور یونیورسٹی کے گریجویس کو ذکر و فکر کی رزم میں پچھاڑ دیا تھا۔ قبلہ جیت گئے تھے اور اب ہم شکست خوردہ نوجوانوں کی زبان پر ان کے جملے جیسے فالج بن کر گر رہے تھے ہم بڑی دیر تک خاموش رہے۔ اپنی فتح کو اور زیادہ مستحکم کرنے کے لیے انھوں نے کہا —— "جب ہم جوان تھے تو ہم نے کیا کچھ نہیں کیا۔ ہم نے

جو چاہا کر دکھایا۔ بسا اوقات ہم نے اپنی توانائی اور اپنی زندگی کی بساط سے زیادہ کام کیے۔ ہمیں زندگی سے کوئی محبت نہیں تھی بلکہ زندگی ہی کو ہم سے عشق تھا۔ ہم ایسی ایسی پُر خطر جگہوں پر جاتے جہاں موت کے چہرے کے خد و خال صاف اور واضح نظر آتے تھے لیکن ہمیں قریب آتا دیکھ کر موت خود ہی بھاگ جاتی تھی۔ اور اب ہم اپنے نوجوان بیٹوں کو دیکھتے ہیں مُرجھائے ہوئے پیلے چہرے۔ مندی ہوئی آنکھیں۔ جھکی ہوئی گردنیں۔ موت سر پر منڈلاتی ہوئی۔ مجھے ایسی زندگی کو زندگی ماننے میں تامل ہے۔"

وہ ہمارا جواب سننا چاہتے تھے۔ مگر ایسی باتوں کا جواب ہی کیا دیا جا سکتا ہے جو بجائے خود سوال بھی ہوں اور جواب بھی۔ ہماری خاموشی کو دیکھ کر پھر انھوں نے کہنا شروع کیا ——— "نرج سے میری بہت سی توقعات وابستہ تھیں۔ میں نے اس کو انگریزی تعلیم اسی لیے دلائی تھی کہ وہ کوئی آزاد پیشہ کرے میں چاہتا تھا کہ وہ قیدی وطن کی بیڑیاں توڑ دے لیکن وہ خود ان زنجیروں میں پھنس گیا۔ میری تمنا تھی کہ میں اپنے بیٹے کے چہرے کو ہمیشہ اونچا، سربلند، شگفتہ اور صحت مند دیکھوں لیکن اس نے اپنی گردن کی ہڈی آپ ہی توڑ ڈالی ہے! اور اب اس کا سر ہمیشہ کے لیے زمین کی طرف ڈھلک گیا ہے۔ میری آرزو تھی کہ وہ اپنے دادا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کی طرح ادب و سیاست کی دنیا میں نام پیدا کرے لیکن اب وہ ایک کلرک ہے!۔ اس کا ضمیر مر گیا ہے۔ اس کی صداقت مر گئی ہے۔ اس کی فطرت غلام ہو گئی ہے اس کی آنکھیں اس کی زبان اس کے ہاتھ پیر سب کچھ فروخت ہو گئے ہیں۔"

ان کی آواز بھرا گئی تھی لہجہ میں کرختگی پیدا ہو گئی تھی۔ زبان اس مضراب کی طرح تیز تیز چل رہی تھی جو کسی مشاق سازندے کی انگلی میں تڑپ رہی ہو اور جب ان کی زبان رکی تو سارے دالان میں ایک بھیانک سناٹا چھا گیا ایسی خاموشی جس میں ڈر معلوم ہوتا ہے۔

پھر وہ دھیمے لہجے میں نوح سے بولے "خیر ——— میں یہاں اسلیے آیا ہوں کہ تمھاری شادی کے لیے تم سے بات چیت کروں تمھیں تعجب ہو گا کہ میں نے ابتک تمھاری شادی کا خیال کیوں نہیں کیا۔ میں تمھارے نوکر ہونے سے پہلے سمجھتا تھا کہ جوانی صرف شادی کرنے کے لیے ہی نہیں ودیعت کی جاتی۔ بلکہ زندگی کے بڑے بڑے معرکے سر کرنے کے لیے ہوتی ہے کیونکہ جوانی میں انسان کی طاقت عروج نقطے پر پہنچی ہوتی ہے لیکن تم عین نوجوانی میں نوکر ہو گئے ہو اور نوکری بڑھاپے کا آغاز ہے۔ یہہ نوکری کا پیدا کردہ بڑھاپا اس بالوں کو سپید اور اعضا کو نحیف و نزار بنا دینے والے بڑھاپے سے زیادہ مہلک ہوتا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ ——— وہ ایکدم خاموش ہو گئے لیکن ہم تینوں نے سمجھ لیا کہ وہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس نوکری کے پیدا کردہ بڑھاپے میں تم کہیں عورت کے بھی قابل نہ رہجاؤ ——— بھلا جہاں ضمیر، سچائی، ذہن اور عزت جیسی غیر مرئی طاقتیں مر سکتی ہیں یہاں جوانی کا مر جانا کیا تعجب ہے ———؟

کس بلا کا طنز تھا اس پرانے رجعت پسند بڈھے میں ———! زندگی کی کیسی مہلک چوٹ کھائی تھی بیچارے نے ———! اپنے نوجوان بیٹے کی

بڑھتی ہوئی عمر اور تعلیم کے ساتھ اس نے کیسی کیسی امیدیں باندھ رکھی تھیں۔
لیکن اس جوانی میں بوڑھے بیٹے کے مرجھائے ہوئے جذبات بجھی ہوئی
طبیعت اور اس کے اندھیرے مستقبل نے اس کو اتنا مایوس کر دیا تھا کہ
وہ اب اپنے بیٹے کو سوا شادی کے اور کسی مصرف کا سمجھتا ہی نہ تھا اب
اس کا لب و لہجہ بہت دھیما اور کمزور ہو گیا تھا۔ ماضی اور حال کو کافی
دیکھی بھالی آنکھوں سے وہ شاید مستقبل میں گھرے ہونے والے اندھیرے
کو بھی دیکھ رہے تھے ——" میں نے نوح کے لیے اپنے ضلع میں ایک
وکیل صاحب کی لڑکی پسند کی ہے تھوڑی بہت پڑھی لکھی ہے۔ اگر
خوبصورت نہیں تو بدصورت بھی نہیں —— آپ لوگ اپنے دوست
سے پوچھئے کہ انہیں یہ رشتہ پسند ہے یا نہیں —؟

ظفر اپنے آپ کو بڑا ترقی پسند سمجھتا تھا بولا ——"بھلا —— نوح
کو یہ رشتہ کیسے پسند آسکتا ہے۔ اس نے نہ تو اس لڑکی کو دیکھا ہے اور
نہ وہ اتنی پڑھی لکھی ہے کہ آپ کے گریجویٹ صاحبزادے کے ساتھ زندگی
بسر کر سکے"!

مجھے ظفر کے یہ جملے سن کر اپنی بیوی فاطمہ یاد آگئی جس کو میں نے نہیں
بلکہ میرے باپ نے پسند کیا تھا۔ جو تھوڑی بہت بھی پڑھی لکھی نہ تھی جو خوبصورت
نہیں تو بدصورت بھی نہیں تھی —————— میرے دل میں اس وقت
نہ جانے یہ تمنا کیوں پیدا ہو گئی کہ خدا کرے نوح کی شادی اسی لڑکی سے
ہو جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نوح میرا دوست ہے میرا محسن ہے

میرا میزبان ہے۔ لیکن میں ایک انسان ہوں۔ ایسا انسان جس کی زندگی کی تاریخ مجبوری نے اپنے قلم سے لکھی۔ اس مجبوری نے ایک بار جہاں مجھے نوح کی جیب سے پانچ روپے چوری کرنے کی ترغیب دی تھی وہاں بھلا اس تمنا کا میرے دل میں پیدا ہونا کوئی تحیر خیز تحیر فزا بات ہے۔؟ میں اب انتقام چاہتا ہوں۔ ہر کسی سے ــــــ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ دنیا کے سب انسان میری طرح مجبور، محکوم اور مفلس ہو جائیں۔ دنیا کا صرف ایک ہی رنگ ہو۔ میری طرح پیلا۔ ایک ہی کیفیت ہو۔ میری جوانی کی طرح مرجھائی ہوئی۔ ایک ہی صورت ہو، میری طرح بسورتی ہوئی ایک نغمہ ہو۔ میری طرح روتا ہوا ــــــ اسی لیے میں نے جلدی سے کہہ دیا "قبلہ ــــــ آپ نوح کے بزرگ ہیں۔ آپ نے انھیں پالا پوسا۔ جوان کیا۔ اور اب جوانی میں بھی آپ ان کی زندگی کا بار اٹھائے ہوئے ہیں بھلا انھیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔"

نوح میری اس تائید سے گھبرا گیا اور اپنی ناراضگی کو مجبوری کے پردے میں چھپانے لگا "مجھے تو کوئی انکار نہیں لیکن میری تنخواہ صرف تیس روپے ہے۔ یہ تیس روپے مجھ اکیلے کے لیے کافی نہیں ہوتے تو میں بیوی کو کیا پال سکوں گا ــــــ"

میں مایوس ہو گیا کیونکہ نوح نے جو راہ فرار ڈھونڈ نکالی تھی اس پر سے وہ بے خطر بچ نکلا تھا لیکن نوح کے ابا کا دنیا کو پچاسی برس دیکھا بھالا دماغ کہیں ایسی دلیلیں مان سکتا تھا۔ انھوں نے کہا "تم اس کی فکر نہ کرو ــــــ جب ہم لڑکی والوں کو ایک گریجویٹ داماد دے رہے ہیں

تو ایک گریجویٹ ہی کے شایان شان جہیز لیں گے۔"
میں نے اپنی تمنا کو پروان چڑھانے کے لیے بے موقع تائید کی" ہاں ہاں ——— ایک ضلع کے وکیل کو ایک گریجویٹ داماد شاید خواب میں بھی نہ ملے۔ وکیل صاحب اور ان کی لڑکی دونوں کو اپنی خوش بختی پر ناز کرنا چاہیے۔ انھیں تو منہ مانگا جہیز دینا چاہیے۔
رسم ورواج کے باغی ظفر نے نفرت سے کہا" ہاں جی ——— بچپن سے جوانی تک ہزار مصیبتوں، آفتوں، بیماریوں سے بچا کر ایک حسین خوبصورت لڑکی دو اور پھر منہ مانگا جہیز بھی نذر کرو۔ اور اگر چاہتے ہو تو لڑکی کے والدین کی زندگیاں بھی چھین لو!
میری طرف سے نوح کے ابا نے وکالت کی" ظفر میاں ——— آپ سمجھے نہیں۔ دنیا کا یہی طور طریقہ ہے۔ ہماری جوانی کے زمانے میں گریجویٹ تو تار کا مضمون پڑھنے کے لیے بھی نہیں ملتے تھے۔ اس زمانے میں تو دیسی ریاستوں کی شہزادیاں تک گریجویٹوں کے لیے ڈھونڈا کرتی جاتی تھیں اب تو گریجویٹوں کا یہ عالم ہے کہ دس میں چار گریجویٹ نظر آتے ہیں۔
نوح کے ابا خواہ مخواہ ہی ایک تمہید اٹھا رہے تھے میں نے جلد سے جلد نفس گفتگو تک پہنچنے کے لیے ان کی بات بڑھ کر اٹھالی" ——— اور جس ملک میں دولت غلط طریقہ پر تقسیم ہو کر جاہل ان پڑھ لوگوں کے حصے میں آتی ہے اس ملک کے گریجویٹیں کا یہ فرض ہے کہ ان جاہل بورژواؤں کی لڑکیوں سے شادیاں رچا کر اس بیکار دولت کا صحیح مصرف دریافت

کریں۔ تجوریوں، الماریوں اور صندوقچیوں میں چھپی ہوئی دولت کو انسان کے کام میں لائیں۔"

ظفر جب بیٹھنے والا تھوڑا ہی تھا۔ "کیا تھکی ہوئی گفتگو کر رہے ہو۔ میں سمجھتا ہوں۔ یہہ وقت آپ کے لیے موقع بچھڑ جانے کا نہیں۔ اس وقت تو بڑی اہم بات ہو رہی ہے۔ نوح کی آئندہ زندگی کا ایک خاکہ بن رہا ہے اور تم فضول میں بہکنے لگے۔"

نوح کے ابا نے روحانیت کی آڑ لی۔ "اگر جلیل کا کہنا غلط بھی ہے تو کیا ہوا۔ شادی زندگی کا ایک متبرک انقلاب ہے۔ شادی زندگی کی اصلی آسودگی ہے۔ اب ہم ہی کو دیکھو۔ جب ہماری شادی ہوئی ہم برکار تھے۔ لیکن جونہی دلہن گھر آئی ہمیں تحصیلداری مل گئی۔ عورت بڑی نیک قدم ہوتی ہے۔"

ظفر نے بات کاٹی۔ "قبلہ یہاں آپ سے مجھے اختلاف ہے۔ عورت نیک قدم کبھی نہیں ہوتی۔ میں سمجھتا ہوں جہاں عورت کا قدم کسی جگہ پڑا نحوست شروع ہو گئی۔ دنیا میں سب سے پہلا انسانی خون جو دھرتی پر بہا وہ عورت ہی کے قدم سے۔ وہ ہابیل اور قابیل ———!"

قبلہ نے انسان کی ابتدائی تاریخ الٹی۔ "مگر آپ یہہ بھی تو سوچئے کہ جب آدم علیہ السلام تخلیق کئے گئے تو وہ اپنی تنہائی سے بہت گھبرا گئے تھے اس وقت حوا کے نرم نرم قدموں کی چاپ سے انھوں نے ایسا محسوس کیا جیسے تنہائی کے اندھیرے میں حوا کا چہرہ آفتاب کی طرح طلوع ہوا۔ حوا کے

تمام منور ستاروں سے زیادہ چمکدار چہرے کو دیکھ کر وہ جنگلوں، وادیوں، کھوؤں اور پہاڑوں کے غاروں کی تاریکی کو بھول گئے۔ ان کے جسم کی "غذائی لذت"[1] کو محسوس کر کے وہ دھرتی کی سنگلاخی اور چٹانوں کی کرختگی کو بھول گئے۔ ان کی زلفوں کی خوشبو سونگھ کر انھیں معلوم ہوا کہ زندگی مسرت بردوش ہے۔"

ظفر کی شوخی بزرگی کا احترام نہ کر سکی۔" واہ قبلہ۔ گلستاں بوستاں کی تعلیم ذہن کی ایک ایک نس میں رومانس بھر دیتی ہے۔ آپ کے آگے تو آج کا رومانوی شاعر بھی ہار جائے۔"

مجھے پھر ڈر ہوا کہ تعریف سے پھسل کر قبلہ کہیں ظفر اور نوح کی طرف نہ ڈھلک جائیں کیونکہ انسان کو زیر کرنے کا صرف ایک ہی کارگر ہتیار ایسی ہی چکنی چپڑی تعریف ہے۔ اس لیے ان شاعرانہ باتوں کو حقیقت کی طرف موڑنے کی کوشش میں میں نے کہہ دیا۔

ہاں قبلہ ——— عورت ایک نعمت ہے ———

پھر بھی ایک پرانی تاریخ الٹی۔" حضرت ہاجرہ اور ان کے بچے نے ریگستان میں ایڑیاں رگڑیں تو پانی کے چشمے پھوٹ پڑے تھے۔ اسی لیے کہتا ہوں نوح کہ تم شادی کر کے تو دیکھ لو۔ تمھاری دلہن کے قدموں سے تمھاری تنخواہ میں اضافہ یا تمھیں ترقی نہ ملے تو پھر ہم سے کہنا۔"

---

[1] غذائی لذت ——— کرشن چندر سے استفادہ

نوح کے ابا نے صاد کیا "بیٹی ــــــ تمہیں اپنی بیوی کے رزق کی فکر آخر کیا پڑی۔ تم تو رزاق نہیں ہو۔ سب سے بڑا رزاق تو خدا ہے اور اس کے انتظام کے کیا کہنے ــــ ہر انسان اپنا رزق اپنے ساتھ لاتا ہے دیکھتے نہیں کہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کی ماں کی چھاتیوں میں خود بخود دودھ اتر آتا ہے۔ ہائے ــــــ اس انتظام قدرت کی کیا ستایش ہو۔ کیا تعریف کی جائے ــــ" اور وہ یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔
دھندلی اور بادلوں کے اندھیرے سے سنولاتی ہوئی شام اپنے سرمئی پروں کو پھیلا رہی تھی۔ نوح کے ابا نے اچکن پہنتے ہوئے کہا "آپ دونوں دوست نوجوان ہیں۔ اپنے دوست سے علیحدگی میں مشورہ کر لیجیے۔ میں ذرا باہر ٹہل آؤں۔ یہ کہہ کر وہ باہر چلے گئے۔ ہم نے بیقراری سے سگریٹ کی چھپائی ہوئی ڈبیاں نکال لیں اور دھوئیں کی تلخی کا مزا لیتے ہوئے نوح کو چھیڑنے لگے۔

پیار کی باتیں

نوح کچھ اس انداز میں شادی سے انکار کر رہا تھا جس سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ یہ انکار، انکار نہیں ہے۔ مگر ظفر اس کے ان بظاہر انکاری جوابوں سے خوش ہو رہا تھا۔ نوح کی آزاد خیالی اور بیدار مغزی کی بار بار تعریفیں کر رہا تھا اور مجھے الجھن سی ہوتی جا رہی تھی ـــــ نوح کے شرمائے ہوئے مسکراتے ہوئے چہرے کا ایک ایک خط کہہ رہا تھا کہ ہر تعلیم یافتہ مفلس نوجوان شادی کی یوں ہی مخالفت کرتا ہے لیکن اسے دلہن سے کوئی مخالفت نہیں۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ تعلیمیافتہ لوگ عام طور پر مفلس ہوتے ہیں۔ وہ شادی نہیں کر سکتے۔ اسی لئے شادی کی مخالفت کر کے تعلیم کی سکھائی ہوئی مکاری سے اپنی مفلسی پر پردہ ڈال دیتے ہیں ـــــ اور بعض ذرا اصولوں کے پابند (جیسا کہ ظفر ہے) ـــــ جو مالتھس کا نظریۂ آبادی جانتے ہیں۔ اور ہندوستان کی غربت، بھوک، احتیاج اور دولت کی غیر منصفانہ تقسیم سے واقف ہوتے ہیں اور ملک کے مستقبل کے بارے میں قنوطی ہوتے ہیں وہ واقعی شادی کی مخالفت کرتے ہیں۔ مگر عورت سے باز نہیں رہتے۔

ظفر اور نوح میں یہی فرق تھا۔ نوح شادی کی مخالفت صرف اس لیے

کرتا تھا کہ تیس روپے میں وہ اپنی بیوی اور اس سے پیدا ہونیوالے بچوں کو نہ پال سکے گا یعنی اگر اس کی آمدنی تیس روپیہ کی دس گنی ہوتی تو وہ شاید چار بیویوں سے شادی کو بھی برا نہ سمجھتا۔ اور ظفر ——— وہ ایک عاشق تشنہ کام تھا۔ میں نے اسوقت ظفر سے کہا۔

یار ——— تم خواہ مخواہی نوح کو بہکا رہے ہو۔ ارے اس کی شادی ہوجائے گی تو اس کی زندگی کی الجھی ہوئی نفیس سنور جائیں گی"۔

ظفر نے حکم سنا دیا" نہیں جی ——— نوح یہہ شادی نہیں کرے گا"۔

ظفر کے اس جملے سے نوح ایک دم زور سے ہنس پڑا اور پھر حیا و شرم کی کسیلی اتار کر شادی کے خیال سے گرگٹ کی طرح سرخ ہوتا ہوا بولا۔

یار ——— ظفر۔ میں تو یہہ شادی ضرور کروں گا" اب تک خواہ مخواہی تم سے ناقص اور شوپنہار سے گھبرا رہا تھا لیکن مجھے یقین ہے کہ میرے مستقبل میں نہ تم کام آؤ گے نہ ناقص اور شوپنہار ——— - - - - مجھے کرہی لینے دو یہہ شادی۔ کوئی مضائقہ نہیں کہ وہ لڑکی میری دیکھی بھالی نہیں۔ مجھے یہہ جاننے کی کوئی ضرورت نہیں کہ اس کی اور میری طبیعتوں کا رجحان کیا ہے۔ بھئی وہ لڑکی تو ہے اور لڑکیوں کے دل پھیر لینا کون بڑی بات ہے اور یہہ طبیعت کون تیس مار خاں ہے۔؟"

ظفر نے کہا" تم پچھتایا کرو گے عمر بھر ———"

نوح شوخ ہو رہا تھا" جی نہیں ——— عورت کی نرم نرم گرم گرم لچکدار لوچدار آغوش میں بیوقوف پچھتایا کرتے ہیں"

ظفر بڑبڑانے لگا "اتنی تعلیم حاصل کرنے کے بعد۔۔۔۔"
نوح نے ظفر کی بات اٹھالی "اتنی تعلیم حاصل کرنے کے بعد تو مجھے کلکٹر بن جانا چاہیے تھا لیکن بن نہ سکا پھر اتنی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اگر ایک جاہل گاؤں والی اور سانولی عورت سے بیاہ کر لوں تو کیا برائی ہے؟"
ظفر نے اعتراض کیا۔ "یہ تم نہیں بول رہے ہو۔ تمہاری مجبوری بول رہی ہے۔ تمہارا عورت کو ترستا ہوا جسم بول رہا ہے۔ یہ عذر معقول نہیں"۔
نوح کے جسم میں ابھی سے دلہن کا نشہ چڑھ رہا تھا۔ بولا "تو اب معقول عذر سنو۔ بات یہ ہے کہ مجھے خوبصورت عورتیں مطلق پسند نہیں۔ اس لئے کہ خوبصورت عورت کو سنبھالنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ ہر خاص و عام کی نظر بد سے بچانا پڑتا ہے۔ خوبصورت عورت کا شوہر گویا اچھا خاصا تاج محل کا داروغہ ہوتا ہے جو ہمیشہ یہ نگرانی کرتا رہتا ہے کہ تماشائی کہیں شرارتاً عمارت کا پلستر نہ اکھیڑ دیں۔ دیوار پر پنسل سے لکیریں نہ کھینچیں۔
اس تشبیہہ پر میں بے اختیار کھل کھلا کر ہنس پڑا اور ظفر نے چڑ کر کہا۔ "بیہودے۔ بے شرم کہیں کے ــــــ"
نوح بولا ــــــ "ابے تو سچی بات میں شرم کا ہے کی اور "بیہودہ" کونسی چڑیا ہے۔ اچھا یہ دلیل نہیں مانتے تو دوسری سنو"۔
میں نے اکتا کر کہا "ارے خواہ مخواہی کیا دلیلیں بگھار رہے ہو۔ شادی تم کر رہے ہو یا یہ شوپنہار کا بچہ ــــــ!"

نوح نے کہا "میں اس کو اس لیے سمجھا رہا ہوں کہ اس کو شادی میں لے چلنا ہے۔ جب تک اس کی الٹی کھوپڑی کو سیدھا نہ کر لیا جائے یہ وہاں نہیں چلے گا۔"

میں نے جواب دیا "چلے گا کیوں نہیں —— وہاں بریانی، تنجن پلاؤ، زردہ جائے اور بڑھیا بڑھیا سگریٹیں ملیں گی۔ یہ بھلا خود کو روک سکے گا۔ بالفرض اگر اقبال کا تصور خودی بہت ہی غالب رہا تو ہم وہاں پہنچ کر ایک اچھے سے میٹھے کا پارسل اس کو بھیج دیں گے۔ بلکہ کیا عجب ہے کہ اس سے پہلے ہی وہ بو سونگھ کر وہاں پہنچ جائے۔"

ظفر اڑ گیا "نہیں میں کبھی نہیں آؤں گا۔ چاہے آسمان سے من و سلویٰ ہی کیوں نہ نازل ہو۔"

نوح اسے منانے لگا "یار تو ہندوستانی اور کٹر اشتراکی ہوتے ہوئے بھی خالص ہندوستانی رنگ کی عورتوں سے متنفر ہے۔ ارے بابا سانولی عورتوں میں نمک بہت ہوتا ہے۔ یہ تمھاری سفید شکر سے بنی ہوئی عورتوں سے زیادہ لذیذ ہوتی ہیں۔"

ظفر سوچ کر بولا "اور تمھاری نمکین عورتوں کے شوہر بڑے نمکحرام بھی ہوتے ہیں۔" ظفر نے بڑے پتے کی بات کہہ دی تھی کہ واقعی ہندوستان میں نمکین بیویوں کے نمکحرام شوہروں کی کمی نہیں۔ اب نوح کا پلہ ہلکا ہو رہا تھا اس لیے اس نے جلدی ہی ڈنڈی مار دی "یہ اتنا بڑا جرم نہیں۔ لیکن مجھے حیرت ہوتی ہے ان لوگوں پر جو اپنی سپید شکر کی بنی ہوئی عورتوں

نعمت کے باوجود ناشکر گذار ہوتے ہیں۔ مجھے ایک قصہ یاد آتا ہے یہاں۔"

ظفر بولا ———"میں قصہ وصہ نہیں سننا چاہتا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم سنجیدگی سے اپنی زندگی کے مستقبل پر غور کر لو ——— اور ——— ابھی ابھی تم اپنی داستان محبت سنا رہے تھے ——— وہ مس ریتا کارلائیل ——— اسی کو کیوں نہیں چلاتے بجائے اس کے کہ ایسی نان سیریس شادی کرو۔"

نوح بولا ——— ارے ریتا کارلائیل تو جانِ جہاں ہے شادی کے بعد بھی وہ میری محبوبہ رہ سکتی ہے۔ اس کو جب تک چاکلیٹ کھانے کا شوق ہے اور میری جیب میں چاکلیٹ کے دام ہماری محبت کبھی تنزلزل نہ ہوگی ——— اب رہی میری بیوی۔ وہ چاہے گوری ہو چاہے سانولی بلکہ کالی ——— عورت تو ہے اور عورت سب سے بڑا حسن ہے۔"

ظفر رائے دینے لگا۔"میں اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ عورت سب سے بڑا حسن ہے۔ میں نے خود بھی بعض بدصورت سے بدصورت عورتوں میں حسن پایا ہے۔ لیکن میں چاہتا تھا کہ تم اس لڑکی کو پہلے ایک نظر دیکھ لو۔ اس سے تھوڑا بہت واقف ہو جاؤ۔"

میں نے نوح کو مخاطب کر کے کہا۔"نہیں نوح تم اس کی باتوں میں نہ آؤ۔ یہ انتہائی خود غرضی ہے کہ تم لڑکی کو دیکھ لو۔ ہاں اس کی اجازت اسوقت دی جا سکتی تھی۔ جب کہ لڑکی کو بھی دیکھنے اور پسند

کرنے کی آزادی ہوتی "

نوح تو خود ہی پہلے سے شادی کرنے پر تُلا ہوا تھا۔ اس کو ہموار کرنے کے لیے ان دلیلوں کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہ تو صرف مذاق کر رہا تھا۔ ایک نئے نویلے دولھا کی سب چہلیں اس میں پیدا ہو گئی تھیں۔ وہ اسی مزاحیہ لہجہ میں بولا ——" ہاں جی۔ میں قصائی تو ہوں نہیں۔ میں تو دولھا ہوں اور فلسفی ظفر صاحب! میں پوچھوں کہ جب حوا کو آدم کے لئے تخلیق کیا گیا تو خدا نے آدم سے ان کی مرضی تو نہیں پوچھی تھی اور نہ آدم نے خدا سے التجا کی تھی کہ اے مالک —— حوا کو ایک نظر پہلے دیکھ لینے دے ——"

ظفر مسکرایا لیکن وہ ابھی تک عورت سے متعلق کتابوں سے سیکھے ہوئے نظریات میں الجھا ہوا تھا۔" بالفرض اگر آدم و حوا کی کہانی صحیح ہے تو میں کہوں گا کہ جب تو حوا ایک ہی عورت تھی اور کیا عجب ہے کہ وہ آدم کو پسند ہی نہ آئی ہو اور انھوں نے قہراً و جبراً اسے قبول کر لیا ہو۔ مگر اب تو کروروں عورتیں ہیں۔ اگر آدم آج ہوتے تو ......"

اب تو مجھے غصہ آگیا اور میں نے پوچھا" ظفر صاحب —— یہ لاکھوں اور کروڑوں عورتیں اس لیے تو نہیں پیدا ہوئیں کہ آپ انھیں دیکھیں، ٹٹولیں، پسند کریں اور پھر ان کا مول تول کریں۔ عورت کا مول تول کرنا انسانیت کی سب سے بڑی بدمذاقی ہے —— جب سے آپ دون کی لے رہے تھے کہ نوح کی دلہن جاہل، غیر تعلیم یافتہ، دیہاتن

اور سانولی ہے۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ ہندوستان میں کتنی عورتیں پڑھی لکھی ہیں اور مجھے یہ بھی بتائیے کہ ملک میں پڑھے لکھے مرد کتنے ہیں۔ اور یہ بھی کہ عورتیں پڑھ لکھ کر کیا کریں گی جب کہ ہماری ——؟ معاشرت نے جو کہ بجائے خود ہمارا مذہب بنی ہوئی ہے۔ عورت کو پردہ اور چار دیواری میں قید کر رکھا ہے۔ آپ اس کو دیہاتن کہتے ہیں۔ لیکن آپ ہی کہیے کہ ہندوستان میں شہر زیادہ ہیں یا دیہات —— ؟ آپ اس کو سانولی کہہ کر ناپسند کرتے ہیں۔ آپ نے خود آئینے میں کبھی صورت دیکھی ہے۔ آپ تو بڑے کمیونسٹ بنے پھرتے ہیں لیکن قیمتی رنگ دیکھ کر تو آپ کی آنکھیں چکا چوند ہو جاتی ہیں۔ آپ دعویٰ کرتے ہیں کہ میں اپنی ریڑھ کی ہڈی کے آخری منکے تک ہندوستانی ہوں لیکن رنگ و نسل کے بارے میں تو آپ پورے بورژوا اور نراانتی ہیں۔

"اہم ——" اہم" نوح کے ابا کھانستے ہوئے داخل ہوئے ورنہ آج میں ظفر کو رلا دیتا لیکن کہ پھر بھی ظفر ایک کھسیانے بلے کی طرح مجھے دیکھ رہا تھا۔

سہرا اور کفن

نوح کی شادی میں ہم نے ہندوستان کی ان تمام رسوم و رواج کے جنھیں جہالت اور رجعت پسندی کہا جاتا ہے' بڑے شاندار مظاہرے دیکھے۔ دولہا سہرا باندھے مسند پر بیٹھا تھا اور وہ مقامی شعرا جو صرف شادیوں پر یا کسی حاکم یا دوست کو رخصت کرتے ہوئے وداعی نظمیں کہا کرتے ہیں اور کبھی کبھار جن کی نظمیں کسی سب سے زیادہ چھپنے والے فلمی رسالے میں چھپ جایا کرتی ہیں ـــــ اپنے سہرے سنا سنا کر ایک دوسرے کو دعوت مقابلہ دے رہے تھے ہے کوئی جو کہہ دے اس سے بہتر سہرا ـــــ! ان میں سے ایک شاعر کے متعلق معلوم ہوا کہ انھوں نے زندگی بھر میں ایک سہرا لکھا ہے اور ہر شادی میں دولہا کا نام بدل کر وہی سہرا سنا دیا کرتے ہیں۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ کسی امریکن سیاح نے ہندوستانی شادیوں میں پڑھے جانے والے سہروں پر ایک بڑا اچھا' مزاحیہ اور طنزیہ مضمون لکھا ہے۔ اس مضمون کو جب میں نے اپنے ایک عاشق وطن دوست کو سنایا تو وہ بڑے جوش میں کہنے لگے کہ یار ایک انجمن بنائی جائے اور اس انجمن کے اغراض و

مقاصد صرف یہ ہوں ان تمام مضحکہ خیز رواجوں کو جو باہر والوں کی ہنسی اور مذاق کا باعث ہیں ختم کر دیا جائے۔

جس وقت دولھا کے سامنے سہرے پڑھے جا رہے تھے۔ اس وقت باہر کے کمرے میں نوح کے ابا اور دلہن کے باپ گرم گرم گفتگو میں مصروف تھے۔ نوح کے ابا بار بار جھنجلا کر کہہ رہے تھے "واہ ـــــــ آپ کو تو دس ہزار کا جہیز دینا پڑے گا۔ آپ نے وعدہ کیا تھا۔ ورنہ میں اپنے گریجویٹ لڑکے کے لیے اس سے بھی زیادہ جہیز دینے والے سے وعدہ کرتا ـــــــ آپ مجھے سمجھتے کیا ہیں۔ ہاں محض آپ کی دوستی اور تعلقات کے مدنظر میں نے دس ہزار جیسی حقیر شرط قبول کرلی۔ اب آپ اس کو بھی کم کئے دینے پر تلے ہوئے ہیں۔"

دلہن کے باپ کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں وہ بھرائی ہوئی آواز میں گڑگڑا رہے تھے "دیکھئے آپ تو جانتے ہی ہیں کہ دلہن کی ماں سوتیلی ہے وہ تو کچھ بھی نہیں دینا چاہتی تھی لیکن میں نے ادھر ادھر سے سات ہزار کا انتظام کرلیا ہے۔ اگر شادی کی تاریخ کچھ اور بڑھا دی جاتی تو میں اور تین ہزار کا بھی انتظام کرلیتا۔

نوح کے ابا قطب بنے ہوئے تھے "نہیں صاحب ـــــــ شادی ہونے کے بعد سب وعدے وعید بھلا دیئے جاتے ہیں ـــــــ میں تو اسی وقت تصفیہ چاہتا ہوں۔

دلہن کے باپ کی آواز دبی ہوئی تھی۔ ان کی نظریں جھکی ہوئی

تھیں۔ مجھے بیچارے پر بڑا ترس آرہا تھا۔ دیکھئے یہ اپنی کنواری معصوم لڑکی کو اپنی قرۃ العین اپنے جگر کے ٹکڑے کو ہمیشہ کے لیے ایک شخص کے قبضہ و اختیار میں دے رہا ہے لیکن اس کے باوجود نذرانہ کم نہیں —— دس ہزار روپے چاہئیں۔ ایک پائی کم نہیں —— کوئی نوح یا اس کے ابا سے خدا کی قسم دیکر پوچھے کہ کیا تم واقعی لڑکی حاصل کرنے کے لیے شادی کر رہے ہو یا تمھیں صرف دس ہزار روپے چاہئیں۔ ان کے قیافے کا غور سے مطالعہ کرو۔ وہ صاف بتا دے گا کہ اگر دلہن زندہ کے بجائے مردہ ہی ان کے حوالے کی جائے لیکن دس ہزار کی تھیلی اس کے کفن سے بندھی ہو تو وہ ضرور بارات کے ساتھ باجوں، نفیریوں، ڈھول تاشوں پٹاخو اور بندوقوں کے شور کے ساتھ، بازاروں میں اس کی ڈولی گشت کرواتے لے جائیں گے۔

مجھے نوح کے ابا پر بڑی سخت حیرت ہو رہی تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ پہلے میں نے ان کی تصویر کا مثبت پہلو دیکھا تھا اور اب منفی رخ دیکھ رہا ہوں جو اصلی حقیقی اور ازلی ہے۔ میں ان کے چہرے کو دیکھ کر پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ کیا یہ وہی بزرگ ہیں جن کے متعلق ظفر نے کہا تھا کہ بڑا فارورڈ بوڑھا ہے —— دی موسٹ پروگریسیو —— یہ بوڑھے کیچلی بدلنا خوب جانتے ہیں۔ آج لیڈر ہیں، تو کل مہاتما، آج قائد ہیں تو کل سرکاری عہدہ دار —— ابھی پرسوں ہی نوح کے ابا نے ہندوستان کی حالت زار

پر کیسے کیسے لکچر سنائے تھے لیکن جب خود پر آپڑی تو رحم اور ہمدردی کے تمام جذبات غائب ہو گئے۔ جب تک انسان خود غرض بے مطلب پرست ہے! اس وقت تک اچھائی اور سچائی دھرتی پر اتر ہی نہیں سکتی۔

اگر نوح کا احسان مجھ پر نہ ہوتا تو میں نوح کے ابا کو صاف صاف سنا دیتا کہ حضرت جائیے ——— اگر میں ہوں تو دس ہزار تو کیا دس کوڑی نہ دوں۔ پرواہ نہیں میری ناک کٹ جائے لیکن کل آپ کی ناک بھی کٹ جائے گی جب آپ کی لڑکی کو کوئی بیاہنے آئے گا، اور دس ہزار کا جہیز مانگے گا ——— جب سب کی ناکیں کٹنے والی ہیں تو اپنی ناک کا مجھے کیا غم ———؟

کاش یہ جملے میں باواز بلند ہی کہہ دیتا کیونکہ دلہن کے باپ کی گڑگڑاہٹ نوح کے باپ کو اور بھی شیر بناتی جا رہی تھی۔ ہندوستان میں ایک بھکاری بن کر جینا تو بہت آسان ہے لیکن ایک جوان کنواری لڑکی کا باپ بن کر جینا بہت مشکل۔

آخر میں طے پایا کہ دلہن کا باپ کسی سے تین ہزار قرض لے لے ——— اور مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ دلہن کے باپ نے وہ سات ہزار بھی قرض ہی لیے تھے۔

نکاح کے وقت جب سب لوگوں کو معلوم ہوا کہ دلہن کے باپ نے دس ہزار کا جہیز دیا ہے تو سب دلہن کے باپ کی تعریفیں کرنے لگے "بھئی واہ۔ اس گاوں میں تو یہ پہلی مثال قائم کی ہے بڑے سنئے ——— " اجی کیا کہنے ——— کسی دیسی ریاست کے راجہ نے بھی اس زمانے

میں اتنا کنیا دان نہ دیا ہوگا" ۔۔۔۔۔۔" ہاں جی یہ مال دولت اولاد پر نہ خرچ ہو تو پھر کس پر خرچ ہو"

لیکن ایک جہاندیدہ بزرگ نے فرمایا۔ لیکن بھیا ۔۔۔۔۔۔ وکیل صاحب کی اور بھی تین لڑکیاں جواں ہیں۔ اس طرح دس دس ہزار ایک لڑکی پر اڑاتے رہے تو ۔۔۔۔۔۔؟

ایک دعوتی نے جواب دیا۔ اجی یہ تو پہلی شادی ہے ان کے گھر کی ۔۔۔۔۔۔ اگر اس میں بھی ۔۔۔۔۔۔"

میں اور ظفر اس کو ڈانٹنے لگے " بتاؤ ۔۔۔۔۔۔ تم نے اپنی پہلی لڑکی کی شادی پر کتنا خرچ کیا تھا ۔۔۔۔۔۔؟"

وہ گھبرا کر بولا۔ اجی صاب ۔۔۔۔۔۔ ہم تو غریب آدمی ہیں"

ظفر نے غرا کر کہا۔ اور وکیل صاحب ۔۔۔۔۔۔ راک فلر ہیں"

وہ ہم دونوں کے بدلے ہوئے تیور اور غصیلی نظروں سے گھبرا کر چپکے سے وہاں سے کھسک گیا اور دستر خوان کے بلے کی طرح ایک رکابی کے پاس بیٹھ گیا۔

پہلی شادی ۔۔۔۔۔۔ اہو ہہ۔ یعنی پہلی شادی میں اپنی ساری دولت لٹا دینی چاہیے تاکہ صرف ایک ہی لڑکی بیاہتا کہلائے اور باقی لڑکیاں یا تو بیسوائیں بن جائیں بھیک مانگیں یا آوارہ مردوں کے ساتھ بھاگ جائیں۔

نکاح بقول ایک ملم داڑھیل بڈھے کے بخیر و خوبی طے ہوگیا لیکن جب

دلہن اپنے دس ہزار میں خریدے ہوئے گرتے بھرتے دولھا کو اپنا کنوارپن عطا کر رہی تھی، عین اسی وقت اس کا غریب و بیکس مجبور باپ اپنی عزت و فضیلت کی بےگرمی سے اپنا گلا گھونٹ رہا تھا۔

دوسری صبح جب نوح فاتحانہ انداز میں حجلۂ عروس سے باہر نکلا اور یہ ٹریجیڈی سنی تو میں نے دیکھا کہ اس نے جبراً اور اخلاقاً اپنے مسکراتے ہوئے ہونٹ بھینچ لیے۔

میں اپنی کھلی ہوئی آنکھوں سے شام تک ٹریجیڈیاں دیکھتا رہا —— ایک بوڑھے وضعدار باپ کا جنازہ۔ ایک یتیم دلہن کے نالے —— تین بیاہ کے سپنے دیکھنے والی کنواریوں کی چیخیں۔ کسی کا دھاڑیں مارتا ہوا سہاگ —— ابھی لاش قبر میں بھی نہ اتاری گئی ہوگی کہ دس ہزار قرض دینے والے بوڑھے تو ندیل ساہوکار نے مکان کی قرقی کا انتظام شروع کر دیا۔ سب کچھ سنا مگر ہمیں کیا اس سے ——

ہمیں تو تین روز سے بڑے مزے مزے کے کھانے مل رہے تھے —— بریانی متنجن، پلاؤ، زردہ، شش رنگا نان گلزار، نان قماش، مزعفر، چوگنی کے چاول، یخنی پلاؤ، کوفتہ پلاؤ، نور محلی موتی پلاؤ، نرگس پلاؤ، ماہی پلاؤ، شاہ پسند دال، دودھ کے کباب، حسینی کباب، شاہی کباب، یخنی کباب، ماہی قلیہ، شمسی قلیہ، فرنی، فروٹ سلاد، رنگ برنگی حلوے —— بدہضمی کی شکایت ہوگئی۔ ہوسٹل کا زمانہ ختم ہونے کے بعد پہلی بار اب یہ شکایت محسوس ہوئی —— تو سے جس وقت میں دلہن کے باپ کے جنازے کی نماز پڑھ رہا تھا کتنی ڈکاریں

آئی تھیں مجھے ــــــــ کسی میں بریانی کی بو تو کسی میں انڈوں کی
پڈنگ مہکتی ہوئی ــــــــ بھئی واہ کیا دعوت کی تھی۔ نوح کے
ابا نے ــــــ اگر یہ دعوتیں بنگال میں کی ہوتیں تو آج ظفر کی۔ بہن
بازاروں میں کبھی نہ ناچتی ــــــ کیا بڑھیا بڑھیا سگریٹیں پینے کو ملی
تھیں۔ واہ۔ گولڈ فلیک تھری فائیو اور کیونڈر تک ہم آدھے پی کر
پھینک دیتے تھے بلکہ جس وقت میں نے دلہن کے باپ کی خودکشی کی
خبر سنی۔ اس وقت گولڈ فلیک سگریٹ کا ایک ہی کش لے کر پھینک دیا
تھا۔ چائے کا تو کچھ پوچھو ہی نہیں جس وقت مرحوم کی بے ہوش بیوی
کو ہوش میں لانے کے لیے منہ میں پانی ٹپکایا جا رہا تھا اس وقت میں تیسری
پیالی حلق میں انڈیل رہا تھا ــــ کیا بہادر ہوں میں۔ مجھے کسی کی تکلیف
یا موت سے کوئی دکھ ہی نہیں تھا ــــ بھئی میرے سینے میں تو پتھر کا
ٹکڑا ہے۔ اور میرا دوست نوح ــــــ وہ بھی میری طرح رجائی ہے۔

کانٹے

شادی کے پندرہ دن بعد نوح اپنی بیوی، سوتیلی ساس اور تین
نوجوان اَن بیاہی سالیوں کے ساتھ شہر لوٹا۔ نوح کے ابا اور دوسرے
سمجھدار لوگ سمجھاتے ہی رہے کہ یہ پلٹن کہاں لے جا رہے ہو۔ اس چکر
میں نہ پڑو ـــــ یعنی جو مرتا ہے اس کو مرنے دو تم نے ساری دنیا کی زندگیوں
کا ٹھیکہ تو نہیں لے رکھا ہے۔ لیکن بنئے نے بیچاروں کو گھر کی قرقی کر کے
گھر چھوڑنے کا نوٹس دیا تھا۔ اب نوح کے سوا ان کا اور کون سہارا تھا۔
میں نے اور ظفر نے بھی نوح کو انھیں ساتھ لے جانے پر بہت مجبور کیا تھا۔
اور نوح تو وہی تو پہلو میں ایک جوان انسانی دل رکھتا تھا۔

نوح کے پراسرار سنسان گھر پر اس پلٹن کے قبضہ کر لینے کے بعد اس کا
گھر نہ پراسرار رہا اور نہ سنسان ـــــ بلکہ وہ عام ہندوستانی گھروں
کی طرح بھر پور غلیظ اور پرشور ہو گیا۔ ان کی وجہ سے مجھے اور ظفر کو بور حو
کے سپاہیوں کی طرح دیوان خانہ میں پناہ لینی پڑی۔ نوح کی بیوی اکیلی
ہوتی تو کوئی بات نہ تھی۔ ہم اسے پردہ کرنے تھوڑا ہی دیتے لیکن نوح کی
نوجوان سالیوں اور غالباً جوان سوتیلی ماں کی وجہ سے منہ ہاتھ دھونے

نہانے، اور "رفع حاجت" جانے میں بڑی دقتیں ہونے لگی۔ آواز لگاؤ ——— پردہ کراؤ۔ ظفر نے ایک دن جھلا کر کہہ دیا بھئی اب ہمارا گزر یہاں مشکل ہے لیکن میں نے اس کو سمجھایا کہ دھرتی پر صرف اس دیوان خانے کا یہ مستطیل ٹکڑا ہی وہ مقام ہے جہاں ہمارا وجود زندہ ہے اس لیے جب تک بہت مجبور نہ ہو جاؤ یہیں گزارہ کرو۔

نوح کی بیوی کیا تھی کوئی چل پری جس نے اپنی آنکھوں کے اتھاہ ساگر میں اتار کر اس کو اپنے "پانی محل" میں قید کر رکھا تھا۔ اور وہ طلسم اس پر پھونک دیا تھا کہ سوا اپنی بیوی کے چہرے کے اس کو دوسروں کے چہرے دھندلے دھندلے نظر آتے تھے۔ اب تو نوح کے گھر رہتے ہوئے بھی کبھی کبھار ہی نوح سے ہماری ملاقات ہوا کرتی تھی۔ وہ دفتر جاتا تھا اور دفتر سے واپس ہوتا تھا یہی دو مواقع اس سے ملنے اور گفتگو کرنے کے رہ گئے تھے۔ ہاں البتہ اتوار کی چھٹیوں میں نوح دو چار گھنٹے ضرور ہمارے ساتھ گزار لیتا لیکن اب اس کی گفتگو میں نہ وہ چہل تھا نہ وہ شوخی ——— ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی بیوی وہ "لا بیلا ڈیم سانس مرسی" ہے جو نوح کے جسم سے زندگی کی ساری شوخی چوس رہی ہے۔ وہ جب بھی ہم سے باتیں کرتا تو اس کی باتیں یوں شروع ہوتیں۔

کیا بتاؤں جان ضیق میں ہے ——— تیس روپے اور اس میں آٹھ آدمی اور پھر یہ لڑائی یہ مہنگائی . . . . . . منجھلی سالی کو کھانسی ہوگئی ہے۔ سالی جی

---

[1] بیت الخلا کا یہ سیاسی نام مخالف فسطائی ذہنیت کی انتہائی بدمذاقی ہے۔ مصنف

ہسٹیریا کے دورے پڑ رہے ہیں چھوٹی سالی کو جانے کیا ہو گیا ہے۔ جب دیکھو چپ چاپ جانے کیا دیکھتی رہتی ہے خلا میں ——— اور وہ باتیں یوں ختم ہوئیں۔

"جی چاہتا ہے کہ کہیں بھاگ جاؤں یا سب کا گلا گھونٹ دوں یا آپ ہی خودکشی کر لوں"۔

ہم دونوں جانتے تھے کہ یہ سب جھوٹ ہے۔ ایسی باتیں ایک مرد کی زبان سے زیب نہیں دیتیں۔ یہ تو عورتیں کہتی ہیں کہ میں گلا گھونٹ لوں گی جان دیدونگی۔ خودکشی کر لونگی ——— میں نے اپنا ایک شبہ ظفر کو سنا ہی دیا یار ——— یہ باتیں نوح نہیں بولتا ہے بلکہ اس کے منہ میں اس کی بیوی کی زبان بولتی ہے"۔

ظفر نے اس بات کی فلسفیانہ انداز میں تائید کی "ہاں تم نے شکسپئیر کی لیڈی میکبتھ تو ضرور پڑھا ہوگا۔ میں کہتا ہوں کہ شکسپیر کا یہ کردار لافانی ہے۔ دنیا کی ہر عورت میں ہر زمانے اور ہر وقت میں تم لیڈی میکبتھ کو جلوہ گر دیکھو گے۔ ذرا کیوں جاؤ یہیں نوح کی بیوی میں بھی لیڈی میکبتھ کو چلتے پھرتے بولتے چالتے دیکھ سکتے ہو۔ اب لیڈی میکبتھ کو ہمارا یہاں رہنا گوارا نہیں ہے اسی لیے وہ نوح کو چابی دے دیکر اس کے منہ سے روز نئے نئے ریکارڈ بجاتی ہے"۔

\+ + + + + + + + + +

یہ بہت ہی اچھا ہوا کہ ان دنوں ظفر پر دق کا آخری شدید حملہ ہوا۔ اور چند ہی دنوں میں دیکھتے ہی دیکھتے نہ جانے اس نے جسم کا سارا گوشت

کیسے گل گیا۔ ہڈیوں پر ڈھیلا منڈھا چمڑا ــــ چہرے پر ملی ہی تھوپی ہوئی ــــ جیسے موت کو ہلدی کھنڈ ے پھیپھڑوں سے بڑا عشق ہوتا ہے۔ سوکھی کھانسی کے ہتوڑوں سے جیسے روح بار بار نکلی جا رہی تھی۔
میں نے اپنے ایک دوست سے جو میڈیکل کالج کا طالب علم تھا اور ایک پنشن یافتہ سول سرجن کا نور چشم سفارش کروائی اور ڈائرکٹر میڈیکل ڈپارٹمنٹ نے دق کے سینٹوریم میں ظفر کا مفت انتظام کرا دیا ــــ
اجازت مل جانے کے دوسرے ہی دن ہم اس کشتہ روزگار، کشتہ عشق اور کشتۂ تعلیم کو سینیٹوریم میں داخل کر آئے۔
اور اسی شام کو میں نے لیڈی سکینہ کی آواز اتفاق سے سن لی وہ شاید اپنی ماں سے کہہ رہی تھی "چلو اماں جان ــــ ایک کانٹا تو دور ہو گیا۔ ان لوگوں میں تو جیسے شرم و حیا ہے ہی نہیں۔ کیسے اطمینان سے رہتے ہیں جیسے انہی کا تو گھر ہے ــــ توبہ بھلی ایسی بھی کیا دوستی۔ میں تو خیر انہیں کب کا چلتا بنا دیتی لیکن" "وہ بڑے نرم دل ہیں۔ دوستوں کے بڑے وفادار۔ کھانا اس وقت تک نہیں کھائیں گے جب تک پوچھ نہ لیں کہ باہر میرے دوستوں کو کھانا بھجوا دیا تھا کہ نہیں ــــ بھلا میں پوچھوں ــ اماں ــــ اس زمانے میں بیٹے باپ کو، بھائی بھائی کو نہیں پوچھتے تو دوست کیا کام کریں گے"۔
اسی اثنا میں نوح آ گیا اور باتیں ختم ہو گئیں۔ اس دن نوح کی تنخواہ ملی تھی وہ آتے ہوئے دو روپوں کی مٹھائی بھی لیتا آیا تھا۔ بڑھیا

سگریٹوں کا ایک پیکٹ بھی خرید لایا تھا۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد وہ بارہ بجے تک مجھ سے ہنس ہنس کر قہقہے لگا لگا کر باتیں کرتا رہا لیکن میری ہنسی کہاں گئی تھی ——؟ میرے قہقہے کدھر تھے ——؟ اس رات خوابوں میں فاطمہ بار بار کیوں آئی ——؟ اس رات میں دیر تک کیوں روتا رہا ——؟

کانٹا —— کتنی تکلیف دہ ہوتا ہے۔ میرا نام بھی اب میں محض ہے کہ بخش کی گالی برداشت کر لوں لیکن کانٹا —— یہ کانٹا برداشت نہیں ہو سکتا۔ یہ تو دل کے گوشت میں چبھتا جاتا ہے۔ یہ تو روح کے گداز میں دھنستا جاتا ہے۔ میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ قبل اس کے کہ کوئی اس کانٹے کو اپنی راہ سے ہٹا دے۔ کانٹے کو چاہیے کہ وہ خود ہی راہ سے ہٹ جائے لیکن نوح نے دو روز کی چھٹی لی تھی اور یہ دن کھیلتے کودتے گزر گئے۔ تیسرے دن جب نوح دفتر چلا گیا تو میں نے تہیہ کر لیا کہ آج اپنا کچھ انتظام کر لیا جائے۔ نوح کے چلے جانے کے بعد کوئی دو گھنٹے بعد ہی میں باہر چلا گیا۔ کئی جان پہچان کے لوگوں سے ملا لیکن ہر جگہ اداسی کا مضمحل چہرہ مجھے گھورتا رہا۔ البتہ صرف ایک جگہ کامیابی ہوئی۔ میرے ایک جاگیردار دوست جو کالج میں میرے ہم جماعت تھے۔ ایک ایجوکیشنل کمیٹی کے اعزازی صدر تھے۔ مجھ سے اس شرط پر وعدہ کیا کہ سالانہ ایجوکیشنل کانفرنس کے لیے میں ایک خطبۂ صدارت لکھ دوں —— بیچارے نے بڑی بے تکلفی سے

صاف صاف اقرار کر لیا تھا کہ میں بھلا اس قسم کے علمی و ادبی خطبے کیسے لکھ سکتا ہوں۔ میرا بچپن تو سارا روز بری کانونٹ میں کرسچین لڑکیوں کو چاکلیٹ کھلانے سینما دکھاتے گزرا۔ جوانی ان لڑکیوں کے ساتھ محبت کرتے ناچتے گزری۔ کالج میں صرف اس لیے داخل ہوا کہ ڈگری مل جائے ورنہ نااہلیت کے سبب جاگیر نہ چھین لی جائے۔ کہیں ——— ——— اب ادھیڑپن میں اپنی پیرس سے لائی ہوئی بیوی کے ساتھ بات چیت کرنے کے لیے فرانسیسی زبان سیکھ رہا ہوں۔

میں نے جواب دیا: "آپ کی یہ صاف گوئی غنیمت ہے۔ لیکن آپ اپنی دولت سے اس قسم کی کانفرنسوں اور کانگریسوں کی جو مدد فرما رہے ہیں۔ یہی مدد ان کانفرنسوں اور کانگریسوں کو زندگی کی سانس عطا کرتی ہے۔ ورنہ ہم جیسے بھوکے بھکاری ان کی صدارت کریں تو ——— کل ہی ان کانگریسوں اور کانفرنسوں کا جنازہ نکل جائے۔" وہ اس روشن قیاس سے اتنے لطف اندوز ہوئے کہ مجھے اس وقت تک اپنے گھر مہمان رہنے کو کہا جب تک کہ میں ایجوکیشنل کانفرنس کا خطبۂ صدارت نہ لکھ ڈالوں۔

میں مسرور سگریٹ پیتا، گنگناتا ہوا گھر لوٹا تاکہ اپنا سامان لے جاؤں اور نوح سے آخری بار رخصت ہو لوں۔ جب میں نے دیوان خانے کی دہلیز میں قدم رکھا تو دیکھا کہ نوح سرخ غضبناک نگاہوں سے دیوار پر ٹنگی ہوئی میری تصویر کو دیکھ رہا ہے۔ میرے قدم رکھتے ہی وہ گرجنے لگا۔

دوست ——— تم میرے دوست ہو۔ میں تمھاری دوستی

جتنا بھی فخر کروں کم ہے۔ خدا کرے کہ مجھے زندگی میں ہمیشہ ایسے ہی دوست ملتے رہیں جو میرے برتن میں بھی چھید کریں اور میری روح کو بھی چھلنی کر دیں۔

میں نے اچکن اتارتے اتارتے پھر پہن لی کیونکہ نوح کے ان جملوں سے شاید کسی ایسی ٹریجڈی کا آغاز ہونے والا تھا جس کے اختتامی باب میں رسوا اور بے آبرو ہو کر مجھے اس گھر سے نکالا جانے والا تھا۔ میں اس کے جملوں سے مطلق نہیں گھبرایا بڑے ہی اطمینان سے پوچھا اور اس کو اس کے نام کے بجائے اس کے لقب سے عمداً اور طنزاً مخاطب کیا۔

"ہاں تو دوست ——— بات کیا ہوئی آخر ———؟

نوح نے اور بھی گرجدار لہجے میں کہا۔" بات کچھ نہیں ہوئی دوست ——— مگر تمھارا مذاقِ حسن بہت خراب ہے۔ تم نے آخر میری منجھلی سالی کو ہی کیوں پسند کیا چھوٹی سالی کو پسند کر لیتے۔ اور میں تو کہوں کہ میری بیوی خود چھوٹی سالی سے زیادہ خوبصورت ہے۔ تم نے میری بیوی کو شاید غور سے نہیں دیکھا۔ اس کی آنکھیں ——— مگر نہیں تمھیں آنکھوں کا حسن شاید اتنا پسند نہیں تمھیں تو عورت کا جسمانی حسن بہت بھاتا ہے۔ لیکن جسمانی تناسب کے اعتبار سے بھی میری بیوی بری نہیں۔ تم نے اس کے رخسار، اس کے ہونٹ، اس کی کمر، اس کی چھاتیاں - - - -"

میں نے غصہ سے پاگل ہو کر نوح کے تیز تیز چلتے ہوئے ہونٹوں پر ایسے زور کا تھپڑ لگا دیا کہ وہ دیوانے کتے کی طرح بھونکنے لگا۔" اور تھپڑ لگاؤ ——— اور طمانچے مارو میرے منہ پر تاکہ میری سانس اکھڑ جائے دوست!

میرے دوست ——— میرے پیارے دوست!"

میں نے جھلا کر دونوں ہتھیلیوں سے اپنے کان بند کر لیے۔ اور نوح کی طرف غضبناک نظروں سے دیکھتے ہوئے تیز تیز تنفس میں بولا ——— مجھے دوست نہ کہو۔ اس کے بدلے مجھے گالی دو۔ میری ماں، میری بہن اور میری بیوی کو فحش سے فحش گالی دو۔ لیکن مجھے دوست نہ کہو للہ دوست نہ کہو۔"

نوح اب چپ چاپ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا اور میں اپنا ٹرنک اپنا بستر، کتابیں، مضامین کے پلندے میلے پاجامے اور قمیص سمیت رہا تھا۔ نوح تھوڑی دیر بعد دھیمے لہجے میں بولنے لگا ——— تم میری غیر موجودگی میں میری نوجوان سالیوں کو تا کا جھانکا کرتے ہو۔ تم انھیں اغوا کرنا چاہتے ہو۔ تم نے آج دوپہر میری منجھلی سالی کا ہاتھ پکڑ لیا اور ...

میں اس تہمت سے واقعی گھبرا گیا لیکن اس متوقع الزام سے گھبرانے کی بات ہی کیا تھی۔ اسی لیے میں نے اس گھبراہٹ میں بھی مطمئن ہونے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا "یہ نظارہ شاید تم نے خواب میں دیکھا ہوگا۔ لیکن دوپہر کو تو تم دفتر میں تھے۔ اس لیے تمھاری بیوی نے یہ خواب دیکھا ہوگا۔"

میرے اس اطمینانِ قلب سے نوح کا پارہ اور چڑھنے لگا۔

"خواب ———؟"

میں نے اثبات میں جواب دیا "ہاں خواب ——— یہ بھی ممکن ہے کہ میں نے یہ خواب دیکھا ہو کیونکہ دوپہر کو جب میں اپنے ایک جاگیردار دوست کے ہاں گیا تھا تو بیچارے نے بڑی لذیذ لذیذ غذائیں

کھلائی تھیں اور اس کے بعد برقی پنکھے کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا اور نرم نرم ریشمی صوفوں پر واقعی میں بڑی دیر تک سوتا اور خواب دیکھتا رہا تھا ــــ"

نوح پوچھنے لگا ــــ "تو یہ واقعہ غلط ہے ــــ؟"

میں نے موقع پاکر اپنی روح کا تھوڑا سا زہر اپنے جملے میں بھر دیا۔

"نہیں جی ــــ یہ بالکل سچ ہے۔ یہ واقعہ تو کسی آسمانی کتاب سے اخذ کیا ہوا معلوم ہوتا ہے ــــ میرے یار۔ میں تو کچھ ایسا خوش مذاق ہوں کہ خواب میں اگر میری ماں بھی جوان ہو کر آجائے تو۔ میں اس کا بھی آنچل پکڑ لوں"۔

نوح کو یہ جملہ بہت گہرا چبھا اور اس نے میرے بستر کو لپیٹتے ہوے ہاتھوں کو پکڑ کر پوچھا، "جلیل ــــ ٹھہرو۔ کچھ دیر کے لیے ٹھہر جاؤ۔ میری بیوی پڑوس میں مہمان گئی ہے۔ وہ آجائے تو میں اس سے پوچھ لوں پیارے دوست میں صفائی کرنا چاہتا ہوں تم تھوڑی دیر ٹھہر جاؤ"۔

میری طبیعت اب بالکل اکھڑ گئی تھی۔ میں نے اپنے ارادے کو باآواز بلند کہہ کر ٹال دیا، "نہیں نوح ــــ اب میرا رہنا بیکار ہے اور تمھارا اپنی بیوی سے کچھ پوچھنا بھی فضول ہے۔ صفائی کا تخیل لغو ہے۔ غلاظت ہی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ اپنی بیوی سے کچھ پوچھنے پچھنے کے بجائے تم شوپنہار کی کتاب پڑھو ــــ اگر یہ کتاب تمھارے پاس نہیں ہے تو لو یہ شکسپیئر کا ڈرامہ "میکبتھ" میں تمھاری نذر کرتا ہوں اس کے پڑھنے کے بعد شاید تمھیں پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑے گی"۔

نوح کے لاکھ منانے اور سمجھانے کے باوجود میں وہاں نہیں رکا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اب نوح کے دل کا شک بھی دور ہو گیا تھا اور میرے من کا میل بھی دھل گیا تھا لیکن میں اپنے جاگیردار دوست سے وعدہ کر آیا تھا۔ وعدے کا تو مجھے اتنا خیال نہیں تھا۔ البتہ اس کے دسترخوان کی وہ چٹخارے دار مرغن غذائیں یاد آ رہی تھیں۔ اس کے مخملیں تکیوں اور صوفوں کا گداز محسوس ہو رہا تھا۔ برقی پنکھوں کی ہوائیں کانوں میں لوریاں گا رہی تھیں۔ وہ جنت یاد آ رہی تھی جو انسان نے انسانی آسائشوں اور خالص انسانی مذاق کے مطابق بنائی تھی۔ مجھے اللہ میاں کی جنت اتنی پسند نہیں جتنی انسان کی بنائی ہوئی جنت۔ اسی لیے میں کشمیر کو اتنا زیادہ پسند نہیں کرتا جتنا لاہور، دہلی، لکھنؤ یا حیدرآباد کو ——
اور اسی لیے ہندوستان میں رہنے کے بجائے اپنی جوانی کو پیرس میں گزار دینے کی ایک تمنا دل میں چھپائے ہوئے ہوں۔

ہر شام نوح کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کو اپنی آنکھوں میں چھپائی ہوئی آنسوؤں کی دھندھ میں سے بڑی دیر تک دیکھتا ہوا میں اس سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا۔

ابوالحسن کا خواب

جاگیردار دوست کے گھر جاکر میں اپنی قنوطیت کو بھی بھول گیا اونچے
ہوادار کمروں میں زندگی پر بہت پیار آنے لگا۔ اگر زندگی میرے جاگیردار
دوست کی فرانسیسی لیڈی کی طرح جسم رکھتی تو میں اس سے لپٹ جاتا۔
اگر زندگی کا چہرہ ہوتا تو میں دیوانہ وار اس کے رخساروں اور ہونٹوں
کو چوم لیتا! جاگتے ہوئے بھی مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے سو رہا ہوں۔ سپنے میں
دیکھ رہا ہوں —— یہ محل —— جسے الف لیلیٰ کے ہیرو
علا والدین کے غلام دیووں اور جنوں نے پلک جھپکتے ہی تعمیر کر دیا تھا۔
اس محل میں نہ بھوک لگتی تھی نہ پیاس۔ جب دیکھو پیٹ بھرا ہے اس
محل میں شب فراق کبھی نہیں آئی۔ تارے گننے اور آہیں بھرنے کی
فرصت ہی نہ ملی۔ دھرتی سے کتنا اونچا تھا۔ یہ محل —— وہاں
نہ انسان کا غم اور زمین کا درد پھٹک سکتا تھا اور نہ رونے اور بلبلانے
کی آواز سنائی دیتی تھی۔ البتہ کبھی کبھار ریڈیو سنتے ہوئے کسی ریڈیائی ڈرامے
کے ایکٹر کی مصنوعی رونے کی آواز سنائی دیتی تھی تو حلق سے ایک
بے ساختہ قہقہہ ابل پڑتا تھا —— جاگیردار کی فرانسیسی بیگم کا بلڈاگ

پھاٹک پر جب کسی بھکاری کو دیکھ کر بھونکتا تھا تو مجھے اسی وقت محسوس ہوتا تھا کہ یہ محل اس دھرتی پر کھڑا ہے جہاں گڑگڑاتے ہوئے بھکاری اور بھونکتے ہوئے کتے رہتے ہیں ـــــــ بھکاری جب اس ولایتی بلڈاگ سے ڈر کر بھاگتے تو فرانسیسی بیگم اپنے بلڈاگ کی تعریفیں کرتے نہ تھکتی تھی۔ اور میں مسکرا کر جواب دیتا۔

"ہاں دیکھیے تو بھکاری اتنا ذلیل انسان ہوتا ہے کہ کتا تک اس کو نفرت سے دھتکار دیتا ہے۔"

وہ یہ تائید نہیں چاہتی تھی وہ اپنے کتے کی بہادری کا قصیدہ سنا چاہتی تھی لیکن میں اتنا نمک حلال کہاں کہ اس کی تعریف میں قصیدہ کہتا۔ اور اس واقعہ میں بہادری کو دخل ہی کیا ہے۔ ولایتی کتا اگر ایک ہندوستانی بھکاری کو بھونک بھونک کر بھگا دے تو تعجب ہی کیا ہے!

اس محل میں رہتے ہوئے۔ سات دن گزر گئے لیکن مجھے معلوم ہی نہیں ہوا کہ وقت کیسے گزر گیا۔ ہر دیوار پر ایک کلاک لگی ہے۔ ہر میز پر ایک ٹائم پیس رکھی ہے۔ ہر کلائی پر ایک گھڑی ہے لیکن کوئی ان گھڑیوں کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا۔ ہر جگہ تاریخ اور دن کے کیلنڈر لگے ہیں لیکن کسی کو یاد نہیں کہ آج کیا تاریخ ہے اور دن کونسا ہے ـــــــ؟ ہر دن چھٹی کے دن کیطرح گزر رہا ہے ـــــــ کیا زندگی ہے واللہ ایک طویل تعطیل ـــــــ نہ زمانہ ڈراتا تھا نہ وقت دھمکاتا تھا ـــــــ زندگی کے لیے ایک محل کی سخت ضرورت ہے۔

وہ انسان جو جھونپڑوں میں زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ بیوقوف ہیں ——
—— پرلے درجے کے بیوقوف۔

ایجوکیشنل کانفرنس کا خطبۂ صدارت ایک ہی دن میں لکھا جا سکتا تھا لیکن ایسی زندگی ایک بار ہاتھ آنے پر بار بار تھوڑے ہی نصیب ہوتی ہے۔ اسی لیے میں روزانہ صرف ایک گھنٹہ لکھا کرتا تھا —— بلکہ لکھ سکتا تھا۔ اور باقی وقت ڈرائنگ روم کی دیواروں پر آویزاں خوبصورت لڑکیوں اور مردوں کی تصویریں اور عورتوں کے مرمریں مجسمے دیکھتا رہتا تھا —— قیمتی خوشبودار سگرٹوں کا دھواں نکلتا اگلتا اپنی اس بدلی ہوئی زندگی کا لمس محسوس کرتا۔ جو اپنی مفلسی کی گدڑی اتار کر اب حریری مخملی لباسوں میں ملبوس ہو گئی تھی۔

آٹھویں دن ایجوکیشنل کانفرنس کا خطبہ ختم ہو گیا۔ اور میرے خلیفہ ہارون رشید نے پچاس روپوں کی ایک تھیلی ہاتھ میں پکڑا کر مجھے پھر سے "ابوالحسن" بنا دیا۔ وہ سہانا خواب ٹوٹا۔ زندگی نے پھر سے وہی گیبرڈین کا میلا بوسیدہ سوٹ پہن لیا لیکن اس سوٹ کی جیبیں جو میرے پیٹ کی طرح ہمیشہ اندر کو دھنسی رہتی تھیں آج تو ندیل نظر آ رہی تھیں۔ ایک بڑی شاندار ریستوران میں دو گھنٹے تک بیٹھ کر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اب مجھے گاؤں چلا جانا چاہیے۔ نوکری قسمت میں لکھی معلوم نہیں ہوتی۔ وہیں گاؤں میں اپنے باپ کی دو بیگھہ زمین پر ہل چلا چلا کر اس زندگی کو اختیار کروں گا جو میری موروثی زندگی ہے جو خالص ہندوستانی

تہذیب ہے۔ اس درانتی کو ہاتھ میں اٹھالوں گا جو ہندوستانی تہذیب کی علمبردار ہے۔ اپنی بیوی کی آغوش میں سما جاؤں گا چودہ سال سے ——— بیاہتا بیوہ کی طرح فراق میں تڑپ رہی ہے۔ بھلا کب تک وہ اس بیوگی سے بھی بدتر زندگی گزارے! بیوی کے یاد آجانے کے بعد اس کے آغوش کے لمس، اس کی زلفوں کی خوشبو اور اس کے ہونٹوں کے رس نے میرے اس ارادے کو اور بھی مستحکم بنا دیا۔

آخری بار ظفر کو خدا حافظ کہنے کے لیے میں سینیٹوریم گیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے میں نے دیکھا کہ ظفر ایک کمسن خوبرو بالی عمریا پتلی کمریا" نرس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ میں قہقہے لگانے کی ناکام کوشش میں صرف نیم جان آواز میں ہنس رہا ہے۔

مجھے دیکھتے ہی وہ بستر پر اٹھ بیٹھا اور مجھے سینے سے لگا کر رونے لگا۔

"جلیل ——— مجھے یہاں سے نکالو۔ میں یہاں ایک لمحہ نہیں رہنا چاہتا۔ یہ سینیٹوریم جیسے موت کی پرچھائیں ہے۔ میں موت کے سائے میں رہ کر نہیں مرنا چاہتا۔ میں تو موت کا مقابلہ کر کے مرنا چاہتا ہوں ——— جلیل مجھے یہاں سے نکالو۔"

میں نے کہا "تم میں اب اتنی توانائی نہیں کہ تم موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر رہو۔ بس اسی طرح بستر پر لیٹے لیٹے موت کا انتظار کرو۔ اور یہ تو تمھاری عین تمنا ہے جیسا کہ تم نے خود ہی کہا تھا کہ بستر پر آنیوالی موت بڑی شریفانہ، معزز اور خاندانی ہوتی ہے ———"

نرس اسے تسلی دینے لگی۔ اس کے لمبے لمبے ملائم بالوں میں اپنی سفید ملائی کی قلموں جیسی انگلیوں سے کنگھی کرنے لگی۔ عورت کی انگلیوں سے پھوٹتی ہوئی گدگدیاں جب اس کے دماغ کو سکون پہنچانے لگیں تو میں نے کہا۔

ظفر ـــــــ اب میں تم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہونے آیا ہوں آج میں اپنے وطن واپس چلا جاؤں گا۔ اپنے والدین کی آنکھوں کا بچھڑا ہوا نور واپس دینے۔ اپنے چھوٹے چھوٹے بھائیوں بہنوں کے بھوکے پیٹ پُر کرنے۔ ان کے ننگے جسموں کو سردی گرمی سے بچانے۔ اپنی بیوی کی ترسی ہوئی آغوش کی پیاس بجھانے ـــــــ"

ظفر نے اپنی پوری پھیلی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔ تم بھی جا رہے ہو جلیل ـــــــ میرا تمھارے سوا اور کون تھا اس دنیا میں ـــــــ؟ کیا میری لاش پر تمھارے آنسو بھی نہ گریں گے۔ کیا میرا جنازہ لاوارث جنازے کی طرح اٹھیگا ـــــــ اچھا جاؤ ـــ تم بھی چلے جاؤ۔"

اس نے اپنا لرزتا ہوا ہاتھ آگے بڑھا دیا اور گرمجوشی سے بڑی دیر تک ہاتھ ملاتے ہوئے ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھتے، بھرائی ہوئی آواز میں بولا "خدا حافظ ـــــــ میرے دوست خدا حافظ۔ میں تمھارا بہت ممنون ہوں زندگی میں تمھاری نوح اور رھندر کی صحبت میں میں نے اپنے غموں اور دکھوں کو جس طرح ہنستے مسکراتے قہقہہ لگاتے برداشت کیا، اس کی یاد مجھے دوزخ میں بھی ستاتی رہے گی۔"

میں نے اپنے آنسوؤں کو روکنے کی بے انتہا کوشش کی لیکن وہ

ابل ہی پڑے اور ظفر کے چہرے پر گر کر اس کے قطروں کی طرح چمکنے لگے۔
ظفر نے مسکراتے ہوئے ایک آنسو سے اپنی ایک انگلی بھگوئی اور
نوکِ زبان پر چکھتے ہوئے کہا۔
میٹھے ہیں ——— تمھارے آنسو بھی میٹھے ہیں۔ دوزخ
میں بھی ......"

میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا "تم بار بار دوزخ کا نام
کیوں لیتے ہو۔ تم دوزخ میں کبھی نہیں جاؤ گے۔ کوئی ہندوستانی
دوزخ میں نہیں جائے گا۔ ہندوستانی کی موت کو شہادت کا مرتبہ
حاصل ہے۔ وہ مظلوم ہوتا ہے۔ غلامی اور استبدادیت سے مجبور ہوکر
کوئی گناہ بھی کرے تو اس کو گناہ نہیں کہتے۔ گناہ تو وہ ہے جس کے
محرک انسان کے تعیشات ہوں۔ اگر کوئی ضروریات زندگی سے
مجبور ہو کر گناہ کرے تو خدا بھی اس کو گناہگار نہیں سمجھتا"
ظفر ان باتوں کے خلوص اور مٹھاس سے محظوظ ہو کر مسکرانے لگا۔
نہیں یار ——— میں جنت میں جانا نہیں چاہتا کیونکہ جنت میں
حوریں ہوتی ہیں۔ عورتیں نہیں ہوتیں"
میں نے اس کے گالوں کے گڑھے میں ایک ہلکا سا تمانچہ جماتے
ہوئے کہا "شریر ———!"
نرس بھی مسکرانے لگی۔ ظفر نے اس کی ٹھوڑی کو چھوتے ہوئے کہا۔
"ڈارلنگ ——— تم کیوں مسکراتی ہو۔ دوزخ میں تمھیں

بھی میرے ساتھ رہنا ہو گا۔"
نرس کی آنکھوں پر پلکوں کے مخملیں غلاف ڈھنک گئے۔ اس کی پلکوں میں ایک آنسو چمکا۔ پھر دوسرا ——— پھر ٹپ ٹپ ٹپ ظفر کی ناک کے بانسے پر شبنم کے قطرے گر گر کر لڑھکنے لگے۔ میں نے غور سے نرس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اور پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن اس نے خود ہی کہنا شروع کیا۔
"یہ بھی ایک بیوقوف عورت ہے۔ کہتی ہے کہ دنیا میں اس کا کوئی نہیں۔ اسی لیے نرس بن گئی ہے۔ میں نے اس کو پہلے ہی دن سمجھایا کہ وہ دنیا اور دنیا والوں سے رشتہ باقی رکھنا چاہتی ہے تو ویشیا بن جائے۔ یہاں سینیٹوریم کی نرس بن کر اس کی آرزو کیسے پوری ہو سکتی ہے۔ یہاں آنے والے تو زندگی سے رشتہ ناطہ توڑ کر بھاگ جاتے ہیں۔ بھلا اس بیوقوف عورت سے کیا رشتہ قایم رکھ سکتے ہیں۔
یہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ جانتے ہو کیوں؟ یہ تو ایک صاف بات ہے۔ ایک ایسے مرد سے جس کا دنیا میں کوئی نہ ہو ایک ایسی عورت کو جو اس کی طرح یکہ و تنہا ہو محبت ہو جانا بالکل فطری ہے ———
وہی آدم و حوا کی پرانی کہانی! یہ رشتہ انسانیت کا پہلا رشتہ ہے اور اسی رشتے نے دھرتی کے چپے چپے پر انسان کی اولاد کو پھیلا دیا ہے۔"
میں نے نرس کی گوری گوری کلائی پر ٹک ٹک کرتی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھا۔ ٹرین کا وقت قریب آتا جا رہا تھا۔ اسی لیے میں نے

پلنگ پر سے اٹھتے ہوئے ظفر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر دبایا اور گلے کے پھندے میں کھنچی ہوئی رکتی ہوئی آواز میں بولا ــــــ خدا حافظ ــــــ خدا ــــــ حافظ"۔

لیکن ظفر لپٹ گیا۔ اور کہنے لگا "نہیں ــــــ ابھی نہیں ــــــ میں تمھیں چھوڑنے اسٹیشن تک آؤں گا۔ میں تم کو یوں نظروں سے اوجھل نہ ہونے دوں گا ــــــ میں بھی چلوں گا"۔

نرس اس کو روکتی اور سمجھاتی رہی لیکن وہ بھلا کس کی بات مانتا تھا۔ اس نے نرس کے ذریعے چوری سے اپنے کپڑے منگوا لیے۔ جن کو پہن کر وہ یہاں داخل ہوا تھا۔ اور دواخانہ کے دیئے ہوئے پجامے اور بنیان پر قمیص اور پتلون چڑھا لی۔ پھر ہم نرس کوارٹرس کے پچھلے دروازے سے باہر نکل گئے۔

فریبِ مسرت

ظفر آج پورے پندرہ دن بعد سینیٹوریم کی موت پرور ہ ڈراؤنی خاموش اور سنسان فضا سے بھاگ کر عابد روڈ کی گاتی، ناچتی پرشور زرق برق زندگی کو آنکھیں جھپکا جھپکا کر دیکھ رہا تھا۔ مسرت سے اس کے پیلے رخساروں کے گڑھوں میں سینیٹوریم کی دواؤں اور غذاؤں سے پیدا شدہ چلو بھر لہو کی دھاریاں پھیل گئی تھیں۔ ہواؤں سے اڑتے ہوئے حریری دوپٹوں، کریپین لڑکیوں کے فراکوں میں سے ڈھلک آئی ہوئی چھاتیوں، ان کے رنگے ہوئے ہونٹوں کی ہنسی۔ ان کی گرگابیوں کی چاپ سے مخمور ہو کر وہ آزردہ لہجے میں بولا۔

"دق کا علاج تمہیں سینیٹوریم یا دواخانوں میں ہو سکتا ہے؟ ارے ان مریضوں کو تو عابد روڈ پر چھوڑ دو۔ یا کسی گرلز کالج کے پھاٹک پر کھڑا کر دو۔ وہ خود بخود بلا علاج تندرست ہو جائیں گے۔"

میں صرف مسکرایا۔ وہ بولا "تم مسکراتے ہو یعنی میں جھوٹ کہہ رہا ہوں۔ تم اگر رک جاتے تو میں اسی طرح تندرست ہو کر دکھا دیتا۔"

اب ظفر کی تندرستی اس کے لئے موت سے بھی زیادہ تکلیف دہ تھی۔ اسی لیے میں نے اس کو مایوس کرنے کے لیے کہا "اب تم تندرست نہیں ہو سکتے۔ تمھارا آخری وقت آچکا ہے"

ظفر نے اسی پر مسرت لہجے میں جواب دیا "یہ آخری وقت بھی بڑا مزیدار ہوتا ہے۔ واللہ کسی عورت کی آغوش میں گزرنے والا وقت بھی اتنا مزیدار نہیں ہوتا جتنا کہ یہ آخری وقت۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

پھر وہ سڑک کے آداب بھول کر میرے گلے میں ہاتھ ڈالے اپنی پسلیوں کو میری بغل میں چھپاتے ہوئے پیار کے انداز میں بولا۔

"یار ——— کیا کرے گا وطن جا کر تو ——— نہیں رہنا۔ یونہی اسی طرح عابد روڈ پر ایک دوسرے کے گلے میں ہاتھ ڈالے خوبصورت عورتوں اور نوجوان لڑکیوں کے پیچھے گھومتے رہیں گے اور جب تھک جائیں گے تو کسی گرلز کالج کی لاری سے ٹکرا کر خودکشی کر لیں گے"

میں نے اپنی گردن اس کے ہاتھ سے چھڑاتے ہوئے کہا "یار ——— تو تو پاگل ہو رہا ہے۔ یہ ہاتھ نکال۔ لوگ کیا کہیں گے ———"

اس نے اپنا ہاتھ نہ نکالا اور پوچھا "لوگ کیا کہیں گے ———؟ لوگ یہی کہیں گے کہ مجھے تجھ سے عشق ہے۔ کیا تجھے مجھ سے عشق نہیں ———؟"

میں نے کہا "ہے بھئی ——— عشق کیوں نہیں مگر سڑک پر گلے میں باہیں ڈال کر چلنے والا عشق مجھ کو پسند نہیں"

وہ اتنی زور زور سے ہنسنے لگا کہ سائیکل پر جاتی ہوئی ایک "سپید رنگ

اور بڑی بڑی آنکھوں والی لڑکی بھی ہمیں بڑی دور تک پلٹ پلٹ کر دیکھتی رہی۔ ظفر نے اس کی طرف منہ چڑاتے ہوئے کہا "چل —— اسی لڑکی کی سائیکل سے ٹکرا کر جان دیدیں گے ——"

میں نے کہا "نہیں — وہ گرلز کالج کی لاری سے ٹکرا کر جان دینے کی تجویز اچھی ہے۔

ظفر ہنس کر کہنے لگا "ہاں واقعی —— ہماری موت سے ان بہت سی لڑکیوں میں سے کسی ایک کو تو محبت ہو جائے گی"۔

میں نے کہا "وہ محبت بعد از وقت ہوگی"۔

ظفر چڑ گیا "جا تو کہیں کے —— محبت کو وقت کی زنجیروں میں جکڑتے ہو۔ محبت کبھی قبل از وقت یا بعد از وقت نہیں ہوتی"۔

میں نے ظفر کا موڈ بدلنے کے لیے ایک نوجوان بھکارن کی طرف اشارہ کیا "دیکھو — گہنایا ہوا چاند —— اس کے جوان چہرے پر مفلس کے دھبے دیکھو۔ کیسی مسکراہٹ ہے اس کی جیسے کیچڑ میں کیچوا رینگ رہا ہو"۔

لیکن ظفر اس بھکارن کو دیکھ کر سمنٹ روڈ سے اپنی نظریں ٹکراتے ہوئے جانے کیا سوچ رہا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ آج اس کے نحیف و نزار جسم میں یہ جنسی ابال اس کو اس بھکارن کو چھیڑنے پر مجبور کر دے گا۔ لیکن اس کا سر جھک گیا تھا۔ کیوں جھک گیا اس کا سر —— ؟ اس نے میرے گلے سے اپنا ہاتھ بھی ہٹا لیا تھا۔ میں نے

اس کی پسلیوں میں کہنی مارتے ہوئے کہا۔ "یار جب تک ایسی زہریلی عورتیں ہندوستان میں ہیں اس وقت تک ہندوستان کا دفاع کوئی مشکل مسئلہ نہیں۔ اب جاپانیوں کو آنے دو یا جرمنوں کو۔ ہندوستان لے لینے کے بعد ایسی عورتیں انھیں تباہ کر دیں گی"۔

ظفر پھر بھی چپ تھا۔ اس کی ساری شوخی غائب ہو گئی تھی۔

میں نے تعجب سے اس کی ٹھوڑی اوپر اٹھاتے ہوئے کہا "تیری یہ سنک مجھے مطلق پسند نہیں۔ یا تو ابھی یہ حال تھا کہ بلبل کی طرح چہک رہا تھا یا ایک بھکارن کو دیکھ کر لگا منہ بسورنے۔ شاید بھکارن کو دیکھ کر آپ کو انسان پر رحم آنے لگا ——— کیوں ——— ؟"

اس نے اس کا بھی کوئی جواب نہیں دیا تو میں چپ ہو گیا۔ اور جیب سے ایک سگریٹ نکال کر جلائی۔ اسی اثنا میں دور سے ایک گرلز کالج کی لاری آتی ہوئی دکھائی دی اور میں نے مذاق مذاق میں کہا۔

"دیکھ وہ آ رہی ہے تیری موت کی دیوی ———"

میں نے وہ جملہ بالکل مذاق میں کہا تھا لیکن جب لاری بالکل ہی قریب آ گئی تو ظفر میرے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑا کر دیوانہ وار دوڑا ——— ایک چیخ ——— لاری کے بریکوں کی کرخت آواز۔

——— اور اندر سے باریک تیز چیخیں - - - - - - - -

لوگ جمع ہو گئے۔ سمنٹ روڈ کے بیچ میں پیلے چمڑے میں منڈھا ہوا ہڈیوں کا ایک کچلا ہوا ڈھیر پڑا تھا جس کے سر سے تھوڑا سا خون تیر رہا تھا۔

زخم کے منہ تک آکر وہیں پھیل گیا تھا۔ لوگوں کے ہجوم میں ایک اور چیخ گونجی۔ "بھیا ——— ! میرا بھیا ——— !!"

وہی زہریلی بھکارن ہڈیوں کے اس ڈھیر پر گر کر سر پیٹ پیٹ کر بال نوچ نوچ کر رو رہی تھی۔ اس کے آنسو مرنے والے کی خواہش کے مطابق اس کی لاش پر ٹپک رہے تھے۔

زبانیں چل رہی تھیں۔

"بیچارا بیمار تھا شائد تنگ آکر خودکشی کرلی"۔

"ہائے کیا جوان مرگی ہے"۔

"بنگال کا بھوکا معلوم ہوتا ہے"۔

"اجی کوئی تعلیمیافتہ بیروزگار معلوم ہوتا ہے"۔

"ہاں جی اس کی جیب میں فاونٹن پین لگا ہے"۔

"پولیس انسپکٹر لوگوں سے پوچھ رہا تھا"۔

اس بھکارن کے علاوہ اور بھی کوئی اس کا رشتہ دار ہے۔

یہاں ——— ؟"

میں نے آگے بڑھ کر کہا "ہاں ——— میں ہوں"

اس نے پوچھا "تمھارا اس سے کیا رشتہ ہے"

میں نے جواب دیا "دوستی ———"

لوگ ہنس پڑے جیسے دوستی کوئی رشتہ نہیں صرف ڈھونگ ہے۔

پولس انسپکٹر نے پھر پوچھا "اس کا نام ———"

میں بہت آزردہ ہو رہا تھا۔ مجھے لوگوں کا اور کسی کا خیال ہی نہ رہا اور میں جیسے اپنے آپ سے بولا "عاشق ——"
لوگ ہنسنے لگے۔ لاش سامنے پڑی تھی۔ اور بھکارن بہن روتے روتے بیہوش ہو گئی تھی۔ پولیس انسپکٹر نے ڈانٹ دیا۔ "مذاق کرتے ہو ——؟"
میرا دل بھر آیا اور میں اسی بے خودی میں بولنے لگا "میں مذاق نہیں کرتا۔ اس کا نام ہی تھا اس کا کام بھی یہی تھا۔ یہ بچپن میں بہت ہنسا کرتا تھا۔ جوانی سگریٹ پینے اور لڑکیوں کے تعاقب میں گزری اور گرلز کالج کی لاری سے ٹکرا کر جان دی ہے۔"
کسی نے کہا "ارے یہ بھی کوئی پاگل معلوم ہوتا ہے بیچارا۔"
ہی ہی ہی —— ہا ہا ہا —— لوگ بے اختیار ہنس رہے تھے۔
اب میں اپنے آپ میں آ چکا تھا۔ میں نے اس وقت دور سے جیسے ریل کی سیٹی کی آواز سنی اور مجمع کو چیرتا پھاڑتا ہوٹل کی طرف دوڑا جہاں میرا ٹرنک اور بستر رکھا ہوا تھا۔

صبح کا بھولا

آسمان پر شفق کے گلابی دوپٹے لہرا رہے تھے۔ میرے گاؤں کے سنسان خاموش اسٹیشن پر گاڑی دو لمحوں کے لیے رکی اور انجن دھنوئیں کے غلیظ بادل اڑاتا ہوا پھر چل نکلا۔ اسٹیشن پر صرف تین مسافر اترے۔ ایک میں۔ دوسرا ایک اندھا بھکاری جس کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر کی بیوی یا داشتہ تھی جنھیں ٹکٹ چیکر نے بغیر ٹکٹ کے سفر کی وجہ سے یہاں اتار دیا تھا۔ میں اپنا ٹرنک اٹھائے بستر بغل میں دابے اسٹیشن سے باہر نکلا۔

ہمیشہ کی طرح ایک ہی تانگہ کھڑا ہوا تھا۔ اس نے مجھے امید دل بھری نظروں سے دیکھا تو میں نے اپنے بغل میں دبے ہوئے بستر کو اور نمایاں کر دیا جیسے اس کو سمجھانا چاہتا ہوں کہ میں نے اپنے والدین کی امید پوری نہ کیں۔ مجھ سے وابستہ ملک و قوم کی توقعات کا گلا گھونٹ دیا تو پھر تو کیوں مجھے امید دل بھری نظروں سے دیکھتا ہے۔

اب اندھیرا گہرا ہو چکا تھا۔ گاؤں کی گلیاں، مزدوری سے واپس ہوتے ہوئے مزدوروں، کھیتوں سے لوٹتے ہوئے کسانوں، چراگاہوں سے آتے ہوئے چرواہوں اور مویشیوں کے قدموں تلے چپ چاپ پیچھے رینگ رہی

تھیں کہیں کہیں سوداسلف کی دوکانوں پر لالٹین کا اُجالا تھا۔ اور پھر اندھیرا ——— مکانوں سے نکلتا ہوا دھنواں، روٹی پکانے کی تھپ تھپ اور ننھے بھوکے بچوں کا رونا، بلبلانا ——— چائے کی اکلوتی دکان ——— جو گاؤں سدھار تحریک کے سلسلے میں انجمن ترکِ مسکرات نے قائم کی تھی یعنی "چائے پیو اور زیادہ دن جیو"۔ یہاں چند بھنکڑے اسی لیے جمع تھے۔

کتنا سنسان، کتنا خاموش گاؤں ——— !

لیکن اسی سنسان گاؤں کی کوکھ سے بڑے بڑے شہر پیدا ہوئے۔ اسی گاؤں کے کھیتوں سے تہذیب پیدا ہوئی۔ تمدن پھیلا، ترقی نے جنم لیا ——— اور یہاں میں نے بھی جنم لیا یعنی گاؤں کے پانچسو انسانوں میں پہلا تعلیم یافتہ، انگریزی جاننے والا، سوٹ بوٹ کے استعمال سے واقف، ترقی کے مفہوم سے آشنا۔ اور کتنے فخر کی بات ہے کہ مجھے اپنے بادشاہ کا نام بھی معلوم ہے۔ اپنے وائسرائے اور بڑے بڑے سروں اور خان بہادروں کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ یہ اعزاز میرے لیے باعث فخر ہے۔ لیکن مجھ میں صرف ایک ہی خرابی ہے کہ مجھے دنیا میں زندگی گزارنے کا ڈھب نہیں آتا۔ مجھے اپنے بزرگوں کی تمنائیں پوری کرنے کا فن نہیں معلوم ———

جب میں اپنے گھر کے دروازے پر پہنچا تو دروازے کی درز سے روشنی کی ایک مدھم سی لکیر جھانک رہی تھی اور پھر سناٹا تھا۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ تھوڑی دیر بعد میرے باپ نے دروازہ کھولا اور میری صورت

دیکھتے ہی تعجب سے بولے "تم ——— کب آئے؟ ——— کیوں آئے؟"

میں نے انھیں نہ سلام کیا اور نہ کوئی جواب دیا۔ چپ چاپ اندر چلا گیا۔ دالان میں بستر اور ٹرنک رکھ کر ستون سے کندھا ٹیکے صحن کے اندھیرے میں دیکھنے لگا ——— باورچی خانے میں فاطمہ کی عرصے سے مضمحل کلائیوں میں اتنی پھرتی آگئی تھی کہ اس کی چوڑیاں بار بار کھنک کر صحن میں چھائی ہوئی تاریکی سے کہہ رہی تھیں کہ اب میں تجھ سے نہیں ڈروں گی کالی ناگن ——— تو مجھے روز ڈستی رہی ہے لیکن آج میں تجھے ڈس لوں گی ایسا ڈسوں گی کہ تو جلد ہی بلبلا کر صبح کے دھندلکے میں چھپ جائے۔

میرے ابا کہہ رہے تھے "تم کیوں آئے ——— کیا نوکری مل گئی؟"

میں خاموش ہی رہا مگر میری خاموشی باتیں کر رہی تھی۔ انھوں نے خاموشی کی زبان خود ہی روک لی۔

"بہت اچھا کیا جو تم آگئے اب میرا آخری وقت آگیا ہے۔"

آخری وقت! ——— آخری وقت! جس کی زبان سے سنو آخری وقت میں نے بھی جی کڑا کر کے جواب دیا "اور میرا بھی آخری وقت آگیا ہے۔"

وہ جھنجھلا کر غصیلی آواز میں بولے ——— "تو جلد ہی کیوں نہیں مر جاتے ——— میں پوچھتا ہوں کہ تم یہاں آئے ہی کیوں ——— جتنا روپیہ میں نے تمھاری تعلیم پر صرف کیا اس روپے سے سود اسلف کی دوکان

ہی کھول لیتا تو آج مجھ پر قرضے کی نالش نہ ہوتی۔ میری بیوی اور تین بچے یوں بھوک اور فاقے سے نہ مرتے۔ اب دو بچے رہ گئے ہیں وہ دونوں بھی نمونیا اور کھانسی سے آخری سانسیں لے رہے ہیں ——— ہونہہ!"

ندامت کے بوجھ سے میری ٹانگیں کانپنے لگیں اور میں وہیں زمین پر بیٹھ گیا۔ اندھیرے میں لالٹین کی زرد روشنی میرا منہ چڑا رہی تھی ———

میاں گریجویٹ ——— شاباش زندہ باش ——— کل تمھارا باپ جیل چلا جائے گا اور یہ دونوں ننھے ننھے بچے بھی مر جائیں گے۔ تمھارے لیے میدان صاف ہے ——— کھل کھل کھل ——— کھل کھل کھل

میرے ابا کہہ رہے تھے "بس جہالت ہی اچھی۔ میں نے اب توبہ کرلی ہے۔ اگر یہ دونوں بچے نمونیہ سے بچ گئے تو انھیں پڑھنا لکھنا کبھی نہ سکھاؤں گا ——— ہل جوتو، گھاس کاٹو۔ پڑھ لکھ کر بیکار رہنے سے یہی بہتر ہے کہ مویشی چراؤ، فصل کاٹو، ہل چلاؤ۔ پڑھنا لکھنا ہم کھیتوں کے مالک بن رہنے والوں کے کیا کام آسکتا ہے ———!؟

میرے منہ میں زبان نہیں تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بوڑھے باپ کا یہ تخیل رجعت پسند اور قنوطی ہے لیکن یہ بھی ایک حد تک سچا ہے ———

——— میں نے اب سے بہت دور مستقبل میں ایک ایسا ہی دالان دیکھا۔ جہاں میرا نوجوان لڑکا اسی طرح ستون کے سہارے بیٹھا ہے اور میں اس پر برس رہا ہوں۔

میں نے تمھیں کالج میں اس لیے تو نہیں بھیجا تھا کہ تم شیکسپیر کے ڈرامے

شیلے کے نظمیں اور ایڈیسن کے مضامین پڑھ پڑھ کر اپنا وقت ضایع کرو۔ تم نے اپنے موروثی پیشے، زراعت کا علم کیوں نہیں حاصل کیا ——— آج تمھاری وجہ سے مجھ پر قرضے کی نالش ہوئی ہے۔ پرسوں میں تھانے میں بند کر دیا جاؤں گا ———"

فاطمہ باورچی خانے سے نکلی اور میں مستقبل سے نکل آیا۔ مستقبل بھی تو ایک باورچی خانہ ہے۔ جہاں دھنواں ہی دھنواں ہے۔ آگ پر رکھی ہوی ہانڈیوں میں کھانے اچھے پکیں گے یا خراب ———؟

فاطمہ شرمائی ہوئی چور نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوے دالان میں دسترخوان بچھانے لگی۔ باپ نے ہاتھ دھوتے ہوے مجھ سے کہا ——— "آؤ ——— جوانی میں بھی اپنے بوڑھے باپ کے کمزور ہاتھوں کی کمائی کھاؤ ——— آؤ"

میں ایک گہری سانس لیتے ہوئے دسترخوان پر بیٹھ گیا۔

رات بستر پر لیٹے ہوے میں فاطمہ کے چہرے کو دیکھنے کے بجائے اس کے گلے میں اپنی مرحوم ماں کا پہنایا ہوا طلائی چندن ہار دیکھتا رہا۔ اس کے جسم سے کھیلنے کے بجائے اس کی کلائیوں میں سونے کے کنگن گھماتا ہوا بہت کچھ سوچتا رہا۔

صبح ہوتے ہی ناشتہ کے بعد میں چندن ہار اور کنگن لیے جا میل دور ضلع کے بازار گیا۔ اور ساڑھے سات سو روپوں کے عوض وہ ہار اور کنگن ایک چربی سے پھولی ہوئی گجراتن کی گود میں پھینک آیا کیونکہ ان کا وہی

اصلی مقام تھا۔ وہ ہار اور کنگن تو ایسی ہی عورتوں کی کلائیوں اور گلے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ ہماری تمہاری بیویاں تو ویسے ہی اچھی لگتی ہیں۔

سارے گاؤں میں میری تحریفیں ہونے لگیں کہ بیٹا اگر کلکٹر نہ بن سکا۔ تو کیا ہوا باپ کو لالہ جوتی مل کے پنجے اور حوالات کی کوٹھری سے تو بچا لایا ابا بھی خوش تھے کہ بیٹا شہر سے کچھ کما لایا ہے۔ اور بوڑھے باپ کی سپید داڑھی پر کلنک کا ٹیکہ نہ لگنے دیا ـــــ فاطمہ مسکرا رہی تھی۔ میں نے جب اس کے ننگے گلے اور ننگی کلائیوں کو دیکھا تو اس نے کتنی سمجھ کی بات کہدی ـــــ! میرے گلے اور کلائیوں کو ننگا دیکھ کر تم افسوس کیوں کرتے ہو۔ اس گلے میں چندن ہار سے بھی زیادہ قیمتی زیور ہے۔ ذرا اپنا ہاتھ تو میری گردن میں ڈال دو۔ اور وہ کنگن! وہ کنگن تو بڑے وزنی تھے۔ تم ذرا اپنے ہاتھوں سے میری کلائیاں تو پکڑ لو ـــــ مجھے انہی کنگنوں کی ضرورت تھی ـــــ" وہ مسکرا رہی تھی اور میں اس کو ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا، جن نظروں میں ایسی باوفا بیوی پر سے اپنی زندگی کو قربان کر دینے کا وعدہ بھی کھلا ملا تھا۔

میں نے تہیہ کر لیا کہ اب اپنے باپ کے ساتھ کھیتوں پر ہل چلاؤں گا۔ فاونٹن پن پھینک کر ہمیشہ کے لیے درانتی اٹھا لوں گا ـــــ اور جیوں گا۔

میرے اس مضحکہ خیز خیال پر آسمان پر چھائے ہوئے بادلوں میں بجلیاں زور زور سے کھل کھلا کر مسکرائیں لیکن برسات نے جیسے ہمارے کھیتوں پر اترنے کی قسم کھالی تھی اور بادل آتے اور ادھر پہاڑیوں کے پیچھے غائب ہو جاتے۔

ساری عمر سات ہمارے کھیت اپنے منہ کھولے بوند بوند کو ترستے رہے۔

جس دن میرا باپ تھک ہار کر مایوس ہو کر کھیت پر جانے کے بجائے چارپائی پر منہ اوندھائے پڑا رہا۔ اسدن شہر سے دو تین بڑی بڑی مونچھوں والے خاکی وردی پہنے سپاہی ہمارے گاؤں آئے۔ زمیندار نے سارے گاؤں میں ڈھنڈورا پٹوا دیا کہ جرمنوں اور جاپانیوں سے لڑنے کے لیے بھرتی ہو رہی ہے گاؤں کے دیروں اور سورماؤں کو اپنی بہادری دکھانے کا سمے آگیا ہے۔

میں بڑی دیر تک اس خوش خبری کی گونج اپنے دماغ میں سنتا رہا۔

"پیسہ ——— روٹی ——— لباس"

میں خوشی سے لہرا اٹھا۔ اور کیا چاہیے تھا زندگی کو۔ اس مہاجنی دور کی یہ بیش بہا نعمتیں مل جائیں گی اور سب دلدر دور ہو جائے گا ——

لیکن فاطمہ رو رو کر مجھے پریشان کر رہی تھی۔ اپنی بڑی بڑی آنکھیں میرے چہرے پر گاڑ کر دیکھتی تھی جیسے پوچھتی ہو ——— کتنے عرصے سے یہ آنکھیں جاگ جاگ کر تمھارا انتظار کرتی رہیں۔ اب تمھاری آغوش نے ایں نیند کا نشہ پلایا ہے تو کیا اتنی جلدی یہ نشہ اتار دو گے ———"

اور جب اس کی زبان کھلتی۔ جنگ موت کا منہ ہے۔ نہ جاؤ۔ پچھلی جنگ پر اس گاؤں سے جو بھی گئے تھے ان میں سے کس نے پھر اپنی صورت دکھائی ہے سوائے رامو کے چاچا اور زہرہ کے بھائی کے ——— اور تو اور رامو کے چاچا کی ایک ٹانگ بھی جنگ میں کٹ گئی ہے۔ زہرہ کے بھائی کے شانے پر بندوق کی گولی کا کالا سوراخ ہے اور وہ بہرا ہو گیا ہے۔"

مگر فاطمہ ایک عورت ہے اور میں اس کا شوہر ہوں ـ میں ـــ اس کی طرح اپنے ہاتھوں میں رنگ برنگی چوڑیاں نہیں پہن رکھی ہیں ۔ میں اپنے دادا کا پوتا ہوں ۔ میرا دادا اسلیمان گاؤں بھر میں ہتیار چلانے میں مشہور تھا ۔ کشتی لڑنے میں اس کا کوئی ثانی نہ تھا ۔ گاؤں کے سب بوڑھے کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ وہ شہر کے پہلوان سے لڑنے گیا تھا تو پہلے ہی مقابلے میں اس کو ایسی تخنیچی دی کہ شہر کے پہلوان کا آدھا سر اکھاڑے کی مٹی میں دھنسا تھا اور وہ بلبلا ہو کر چت پڑ گیا تھا ۔ ایسے کڑیل دادا کا پوتا جنگ پر نہ جائے تو اپنے دادا کا نام ڈبو دے ـــــ !

ضعیف باپ ـــــ یہ محبت کرنے والی بیوی ۔ یہ دو ننھے ننھے بھائی ـــــ پانچ پیٹ ـــــ پانچ ننگے جسم ـ !

میں فاطمہ کو بہلاتا رہا ۔" پگلی ـــــ تو کیا جانے سپاہی کے ٹھاٹھ ـــ زندہ واپس ہوئے تو لاٹ صاحب بن گئے ـ تو نے دیکھا نہیں رحو کے چاچا اور زہرہ کے بھائی کو ۔ انہیں بڑے بڑے انگریزوں نے تعریف کے کاغذ لکھ کر دیے ہیں ۔ ارے وہ تو اپنے بادشاہ سے بھی ہاتھ ملا کر آئے ہیں ۔ جنگ سے پہلے یہ گاؤں کے باہر بھیڑیں چراتے تھے ۔ آج گھر میٹھے پلاو کھاتے ہیں ۔ زمیندار جو پہلے ان سے مار مار کر بیگار لیا کرتا تھا ۔ اب کیسی خاطر سے ان سے ملتا ہے ۔ اپنا حقہ انہیں پلاتا ہے ۔"

وہ پوچھتی ۔" اور موت ـــــ ؟"

میں ہنس پڑتا ۔" ارے موت سے کیا ڈرنا ـــــ اول مرنا

آخر مرنا بستر پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دید ینے سے تو یہی بہتر ہے کہ جنگ کے میدان میں شیروں کی موت مریں۔ اور دیکھو! ـــــ نارائن جوتشی نے مجھ سے کہا ہے کہ میں پچانوے برس تک نہیں مر سکتا۔ ابھی تو مجھے صرف ستائیسواں سال لگا ہے ـــــ ابھی اتنی بڑی عمر پڑی ہے

ـــــ"

میں جانتا ہوں کہ میں جنگ سے واپس نہیں آؤں گا لیکن عورت کو سمجھانا بھی کتنا آسان ہے۔ نارائن جوتشی کا نام سن کر اس کے گھبرائے ہوئے چہرے پر اطمینان کا ہلکا ہلکا سا نور چھا جاتا۔ بھلا گاؤں میں نارائن جوتشی کی بات کو کوئی جھٹلا سکتا ہے۔ گاؤں بھر کا مانا ہوا برہمن ـــــ رجبن کی شادی ہوئے سات برس گزر گئے تھے کوئی بچہ نہ ہوا تھا مگر اس نے ایک ہی گنڈا دیا اور نواں مہینے ختم ہوتے ہوتے ایک چاند سا بچہ گودی میں کھیلنے لگا۔ رجب کی ماں کو کالا روگ چمٹا تھا اس نے سات پڑیاں دی تھیں۔ سات دن کے اندر اندر چٹ پٹ کرتے کالا روگ چھوٹ گیا۔

اس لیے وہ مطمئن ہو گئی کہ میں جنگ میں بھی مر نہیں سکتا۔

ایک دوپہر کو اپنی بیکاری سے عاجز آکر میں مکان کے باہر چبوترے پر بیٹھا اپنے دادا کی پرانی زنگ آلود بندوق کو کھوپرے کے تیل سے رگڑ رگڑ کر صاف کر رہا تھا کہ رامو کا چاچا لنگڑا لنگڑاتا آتا ادھر آنکلا۔ اور اپنے ٹوٹے ہوئے دانتوں سے ایک مکروہ ہنسی اگلتا ہوا بولا۔

"بھیا ــــــ تو تو بڑے زور شور کی تیاریاں کر رہا ہے کیا اکیلے ہی ساری لڑائی جیت لے گا۔"

میں نے اس کو چارپائی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔ "ہاں چاچا اکیلے ہی جیت لوں گا۔ دیکھ لینا۔ ہاں چاچا تم تو پچھلی لڑائی میں ولایت بھی گئے تھے۔ کچھ ہمیں بھی بتاؤ وہاں کے حالات ــــــ"

چاچا نے میری سگریٹ کی ڈبیا میں سے ایک سگریٹ نکال کر جلاتے ہوئے کہا۔ "ارے بھیّا ــــــ کیا بتاؤں۔ انگریز کے راجہ کا گاؤں کیا ہے۔ سورگ ہے بس سورگ۔ بس دیکھتے ہی رہ جاؤ۔ ہم نے بڑے مزے اڑائے وہاں۔ مفت کھانا۔ مفت کپڑے اور۔۔۔ وہ شرماتے ہوئے کہنے لگے۔ اب تجھ سے کیا چھپانا۔ تو نوجوان ہے۔ ہی ہی ہی۔"

یعنی چاچا اب وہاں کی عورتوں کی باتیں سنانے والے تھے۔

"ــــــ گوری گوری میمیں ــــــ لال چقندر جیسا منہ۔ سونے کے تاروں جیسے بال ــــــ نیلی نیلی کنجی آنکھیں۔ لچکتی کمریں۔ بھرے بھرے جسم۔ ہا۔ کچھ نہ پوچھ بھیّا۔ ان پریوں کی جب یاد آتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری جوانی لوٹ کر آ گئی ہے۔"

میں بے ساختہ ہنس پڑا۔ اور پوچھا۔ "کیوں چاچا ــــــ آج افیم بہت کھا گئے کیا۔؟ تمھیں پریاں ہی پریاں نظر آ رہی ہیں ــــــ"

چاچا ناراض ہو کر کہنے لگے۔ "لے بھیا ــــــ تو خود ہی

سٹھیا گیا ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ایک مرتبہ پارک میں ایک میم میری طرف دیکھ کر مسکرائی بھی تھی اور اشارے سے۔۔۔۔

اب تو میں چارپائی پر ہنسی کے مارے لوٹ گیا۔ چاچا بہت بگڑ گئے اور اٹھ کر بڑبڑاتے اور لنگڑاتے چلے گئے۔ میں انھیں دور تک لنگڑاتے جاتے دیکھتا رہا اور ایسا محسوس کرنے لگا جیسے میں بھی انگریز کے راجہ کے گاؤں پہنچ گیا ہوں اور ریسہ غذا الباس اور گوری گوری میمیں ——

—————— وہ انگریز کے راجہ کا سورگ۔ مجھے ایسا ہی کوئی سورگ چاہیے۔ مجھے انسان ہی کا بنایا ہوا سورگ چاہیے۔ میں خدا کے سورگ میں نہیں رہنا چاہتا۔ اسی لیے کشمیر کے قدرتی نظاروں سے زیادہ مجھے لاہور، دہلی، لکھنؤ، حیدرآباد، بمبئی، کلکتہ جیسے شہروں کے مصنوعی نظاروں سے عشق ہے۔ ہندوستان کے بجائے اپنی جوانی کو پیرس میں گزارنے کی تمناؤں میں چھپائے ہوئے ہوں ——

اسی شام کو جب میں نے سنا کہ گاؤں میں بھرتی کرنے والے افسروں کی ایک لاری آئی ہوئی ہے تو خوشی سے اچھل کر اپنے دونوں ننھے بھائیوں کی موجودگی کو محسوس کئے بغیر میں نے فاطمہ کے ہونٹ چوم لیے۔

لوری

اب میں جا رہا ہوں۔ ہندوستان سے مرگ کے مُنہ میں جا رہا ہوں۔ انگلینڈ کا ڈاک شام کی پیلی پیلی آخری سانس لیتی ہوئی اداس دھوپ میں لیٹی ہوئی ہے۔ ساریوں، فراکوں، دھوتیوں، پتلونوں، پاجاموں اور شلواروں کا ہجوم ٹکٹکی باندھے مجھے اور میری طرح کی خاکی وردی میں ملبوس ہزاروں ہندوستانی سورماؤں کو خدا حافظ کہہ رہا ہے۔ جہاز کے ڈاک پر ایک طوائف اپنی رسیلی آواز کی مدھر تانوں سے ہم سورماؤں کا دل، حوصلہ اور ہمت بڑھا رہی ہے ——

"میرے دیس کے نوجوان جا رہے ہیں"۔ مگر یہ میرے دونوں ننھے ننھے بھائی اس طرح گھبرائی ہوئی، ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے مجھے کیوں دیکھ رہے ہیں۔؟ اور یہ فاطمہ کی پلکیں کیوں جھکی ہوئی ہیں؟ وہ میری طرف کیوں نہیں دیکھتی؟ آنسوؤں کی بوندیں اتنی وزنی کہاں کہ پلکیں اوپر کو اٹھ ہی نہیں سکتیں —— ایک نظر تو میری طرف دیکھ لے جانِ عزیز —— میری پیاری! تیری صرف ایک نظر اس طوائف کے حوصلہ بڑھانے والے گیت سے کہیں زیادہ جرأت میری رگ و پے میں

سمو دیگی۔ تیری اس ایک نظر کو میں اپنے جسم کے ایک ایک حصے پر محفوظ کر لوں گا۔ جب میں جنگ کے میدانوں میں اپنے آقا کے دشمنو کو ٹکی کے بھٹوں کی طرح کاٹتا جاؤں گا تو اس وقت مجھے صرف یہی احساس ہوگا کہ تیری وہ آخری جادو دانی نظر مجھے دیکھ رہی ہے ——

—— پگلی ایک نظر تو دیکھ لے۔ ہم ہندوستانیوں کو اپنی بہادری دکھانے کا ایک ہی موقعہ تو ملتا ہے۔ جب دنیا کے بڑے بڑے انسان آپس میں لڑ پڑتے ہیں —— تو فخر سے اپنی گردن اٹھا کر ان عورتوں کو حقارت سے کیوں نہیں دیکھتی جو اپنے سر جھکائے ہوئے افسردہ کلرک شوہروں کے ساتھ ساحل پر سیر کرنے آتی ہیں۔ تیرا شوہر —— تیرا دولھا تو ایک سپاہی ہے جس کی سوپشتوں میں بھی کسی نے ہاتھ میں تلوار نہ پکڑی۔ سب کے سب کسان تھے جو ہل چلا چلا کر لگان دے دے کر، بیگار اٹھاتے اٹھاتے، لاتیں، جوتے، گالیاں کھاتے کھاتے مرگئے۔

دیکھ —— میری اس خاکی وردی کو دیکھ۔ اس پیلی پیلی دھوپ میں یہ لوہا کی ہوئی قمیص کیسی چمک رہی ہے۔ پتلون کی کریز کیسی سخت اٹھی ہے۔ یہ ترچھی خاکی ٹوپی جس پر پیتل کے بٹن جگ مگ جگ مگ کر رہے ہیں۔ یہ بندوق۔ یہ تھیلا یہ جوتے —— بخدا شادی کے روز میں پھولوں والی اچکن میں بھی اتنا بانکا سجیلا نہیں نظر آرہا تھا جتنا کہ آج —— پیاری آخری بار بچھڑنے والے کو یوں نہیں جدا کرتے —— دیکھ یہ انگریز عورت کس طرح اپنے شوہر کو بھینچ بھینچ کر اپنے مسکراتے ہوئے

ہونٹوں کا امرت پلا پلا کر اس کی رگ رگ میں نئی زندگی، نیا جوش، اور نیا نشہ پیدا کر رہی ہے تو اگر مجھے رسیلے ہونٹوں کا امرت نہیں پلا سکتی۔ نہ سہی۔ مجھے نظروں کا امرت ہی عطا کر دے، ـــــــ مجھے بیج جاودانی لافانی امرت چاہیے ـــــــ ہونٹوں کا نشہ تو بہت ہی جلد سگرٹوں اور شرابوں میں گم ہو جاتا ہے۔

بیوقوف عورت ـــــــ! یہ ساحل ہے۔ یہاں ہم کو ایک دوسرے سے بچھڑنا پڑتا ہے۔ باپ بیٹے سے بچھڑ رہا ہے۔ بیٹا باپ سے جدا ہو رہا ہے۔ بیوی شوہر کے آغوش سے چھوٹ رہی ہے۔ عاشق محبوبہ کی بانہوں سے الگ ہو رہا ہے۔ رشتے ناطے سب ٹوٹتے جا رہے ہیں۔ صرف ایک ہی رشتہ اٹل ہے۔ دوامی ہے۔ آقا اور غلام کا رشتہ ـــــــ کبھی نہ کبھی تو ہمیں اپنے آقا کے پاس جانا ہی ہے۔ یہ میری خوش نصیبی ہے کہ میں اپنے سب آقاؤں کا حقِ نمک ادا کرتا اس آقا کے پاس چلا جاؤنگا جہاں تجھے اور مجھے سب کو جانا پڑے گا ـــــــ میں کس عزت اور شان سے تجھ سے جدا ہو رہا ہوں۔ تو مجھے سُور ما نہیں سمجھتی۔ نہ سہی۔ میرے جسم پر سورماؤں کی وردی تو ہے۔ اور آج کل یہی کافی ہے۔ زمانہ اسی گدھے کا ہے جو شیر کی کھال اوڑھ کر شیر کہلاتا ہے۔ میرے باپ نے تجھ سے غلط کہا کہ سپاہی تو پچھلی جنگ عظیم ہی میں مر گیا۔ اب صرف بھاڑے کے ٹٹو رہ گئے ہیں۔ مگر میرا باپ بہت بوڑھا ہے۔ میں اس کو کس طرح سمجھاؤں کہ جب سونے اور چاندی کے سکے کھنکھناتے ہیں تو ایک نئے ول

کی رگوں میں بھی لہو جوش مارنے لگتا ہے۔ دنیا کی سب سے زیادہ بڑھاوا دینے والی، جرأت پیدا کرنے والی موسیقی چاندی کے سکوں کی کھنکھناہٹ ہے۔ جب تک دنیا میں چاندی کا ایک سکہ بھی جگمگاتا، کھنکھناتا ہے کوئی انسان بزدل نہیں۔

یہ میرے آقا کا دشمن ــــــ اٹلی جس سے میں لڑنے جا رہا ہوں۔ پہلے یہ صرف عورت کا سورما تھا۔ تو اگر پڑھی لکھی ہوتی تو تاریخ تجھے بتا دیتی کہ ان اٹلی والوں میں صرف عورت کو اپنے سینے سے بھینچنے اور اس کے ہونٹ چومنے کی توانائی ہوتی تھی۔ ان کے پیروں میں صرف ناچنے کی طاقت ہوتی تھی۔ ہتیاروں کے بجائے وہ پھولوں کے گلدستے بہت پسند کرتے تھے لیکن ان کے (ڈکٹیٹر) نے آج انھیں حبش، بلغاریہ اور شمالی افریقہ کا فاتح بنا دیا ہے۔ اس نے اپنے کارخانوں میں پہلے پہل ہتیار ہی نہیں تیار کئے بلکہ اپنی ٹکسالوں سے چاندی کے سکے ہی سکے ڈھلوا گئے! اور اٹلی کے پیشہ ور ناچنے والوں، ایکٹروں، قوالوں، نقالوں، بھانڈوں، شرابیوں اور عاشقوں کو تک سورما جنگجو اور فاتح بنا دیا۔

میرے بادشاہ کا احسان ہے کہ اس نے ہندوستان کے مزدوروں، کسانوں، مچھیروں، سپیروں، موچیوں، نائیوں، قصائیوں، مہتروں اور بیگار اٹھانے والوں کو شمشیر بکمر بنا دیا ہے ــــــ یعنی انسان بنا دیا ہے۔ میں جھوٹ نہیں کہہ رہا ہوں۔ وہ انسان انسان ہی نہیں جو شمشیر بکمر نہ ہو جس نے اپنی زندگی میں کسی دوسرے انسان کا خون نہ بہایا ہو۔

ہو۔ آج تک مذہبوں عقیدوں پیغمبروں اور رشیوں نے انسان کو غلط راستے بتائے تھے کہ انسان دوسرے انسان کا خون نہ بہائے۔ آج اگر ان مجذوبوں کی بڑ پر عمل کیا جاتا تو انسان کی نسل کبھی کی ختم ہوگئی ہوتی تہذیب وتمدن کے نام لغت میں بھی نظر آتے تہذیب اور تمدن کی بقا کے لیے انسان کے لہو کی سخت ضرورت ہے۔ آج جو سرمایہ دارانہ تہذیب پھیلی ہے وہ ان لوگوں کے خون سے سینچی گئی ہے۔ جو سرمایہ دار نہ تھے اس جنگ کے بعد جو انگریزامریکی تہذیب پھیلے گی وہ جرمنوں جاپانیوں اطالویوں اور ہندوستانیوں کے لہو سے پیدا ہوگی۔

پیاری فاطمہ! کاش تو پڑھی لکھی ہوتی تو میں تجھ کو باسانی سمجھا سکتا کہ دنیا کو انگریزامریکی تہذیب کی کتنی ضرورت ہے ——؟ انگریزوں اور امریکیوں نے انسان کی ترقی کے لیے تہذیب کے لیے کیسے کیسے کام انجام دیے۔ یہ جہاز یہ موٹریں یہ ریلیں، یہ ریڈیو! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب تک انسانیت کے یہ محسن دھرتی پر ہیں۔ خدا کی بھی ضرورت نہیں —— تو جانتی ہے کہ جب تو بیمار تھی اور شاید مرنے والی تھی اس وقت انگریزی دوا کی صرف ایک چھوٹی سی شیشی نے تجھے عزرائیل کے پنجے سے بچا لیا تھا۔

یہ ہمارے آقا نہ صرف اپنے غلاموں کے محسن ہیں بلکہ خدا کے بھی بڑے مخلص دوست ہیں۔ میرے آقا نے خدا کی بہت ساری ذمہ داریاں اپنے سر لے لی ہیں۔ اب خدا سب کچھ ان کو سونپ کر صرف طلوع اور غروب

کا کام انجام دیتا ہے اور پھر آرام سے عرش پہ سوتا رہتا ہے۔ اب تو وہ غریبوں اور دکھیوں کی آہیں بھی نہیں سنتا۔ اب یہ تیرے جیسے بیوقوف جاہل ہندوستانی بار بار اس کی طرف منہ اٹھا کر فریاد کرتے ہیں اور مایوس ہو کر بڑبڑانے لگتے ہیں ——— یہ ہندوستانی میرے آقا سے کیوں نہیں رجوع کرتے جس نے ہمارے کھانے پینے، پہننے اوڑھنے اور جینے مرنے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے ——— میں پوچھوں میرے آقا کے پاس کیا نہیں ہے ——— اس نے خدا کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے رزاقیت اور ستاریت کی خدائی صفتیں خود میں منتقل کر لی ہیں میری ملکہ ——— میں نہ جانے کیا بک رہا ہوں۔ مگر آخری وقت انسان کی زبان سب کچھ کہہ دینا چاہتی ہے۔ ضروری اور غیر ضروری سب ——— تیری کھوپڑی میں اتنی بڑی باتیں کہاں سما سکتی ہیں۔ تہذیب کا مفہوم سمجھنے کی کوشش میں نطشے اور اقبال بھی مر گئے ——— تو تو صرف کھانا پکانا جانتی ہے۔ اپنے شوہر کی خدمت کرنا جانتی ہے۔ اور یہ تہذیب نہیں ہے ——— یہ تو بد تہذیبی ہے۔ اسی وجہ سے میں تجھ سے محبت نہیں کرتا البتہ مجھے تجھ سے ہمدردی ہے۔ میں صرف ان عورتوں سے محبت کرتا ہوں جو کھانا پکانا نہیں جانتیں اور اپنے شوہر کی خدمت نہیں کرتیں ——— بات یہ ہے کہ میں بہت مہذب ہوں۔ اسی لیے نہیں چاہتا کہ تو مجھ کو اس طرح بھیگی ہوئی پلکوں اور سسکتی ہوئی سانسوں سے خدا حافظ کہے ——— اگر تو مہذب ہوتی تو ایک تیتری کی طرح اڑ کر

میرے آغوش میں سما جاتی۔ اس انگریز عورت کی طرح اپنے مسکراتے ہونٹوں سے مجھے وداع کرتی۔ اگر تو مہذب ہوتی ——— ! تو تہذیب نہیں جانتی اسی لیے کہتا ہوں کہ صرف نظروں کا امرت پلا دے! آخری بار!! میری طرف دیکھ۔ میں چاہتا ہوں کہ آخری بار تیری آنکھوں میں بس جاؤں تاکہ تیری آنیوالی بیوگی کے کٹھن زمانے میں مجھے میری فرقت کا غم ستایا نہ کرے۔ اگر تو مہذب ہوتی تو مجھے کوئی فکر نہیں تھی۔ میں جس تہذیب سے مجبور ہوکر آج اپنے جیسے انسانوں کا خون بہانے جا رہا ہوں اسی تہذیب کی بدولت تو میرے بعد میری عزت کا خون کرتی۔ تہذیب خونریزی ہی تو ہے ——— !

پیاری ——— تیرے پیٹ میں میری جو پہلی ——— اور شائد آخری نشانی پھڑپھڑا رہی ہے۔ اس کو بھی میری طرح سورما بنانا۔ پروا نہیں کہ وہ بھی میری طرح چوبیس روپیہ آٹھ آنے کا سورما ہی کیوں نہ ہو۔ مگر ہم نے نمک کھایا ہے۔ ہم ہندوستانی ہیں اور ہماری تاریخ ہمیں سکھاتی ہے کہ اپنی ماؤں بہنوں اور بیٹیوں کو بیوا بن جانے دو مگر نمک حرامی نہ کرو ——— اور ہاں یہ یاد رکھیو کہ اس کا نام میر جعفر یا میر صادق رکھنا۔ کیونکہ یہ دونوں نام بڑے متبرک ہیں۔ ان کی میرے دل میں بڑی عزت ہے۔ اپنے مالک کی آقائی کا بنیادی پتھر اس شورش پسند باغی سرزمین پر جنھوں نے رکھا ہے۔ وہی دونوں متبرک ہستیاں تھیں۔ اب میرا لڑکا اس پتھر پر اپنے آقا کی عمارت کو تعمیر کردے گا

اپنے آقا کا خواب مکمل کر دے گا۔

پگلی ـــــ تو اس طرح بلک بلک کر بچوں کی طرح رو رہی ہے تیری یہ پھٹی پھٹی آواز، یہ آنسوؤں کے دھارے میرے پاؤں میں لغزش، میرے دل میں کمزوری اور میرے دماغ میں کمزورانہ خیالات پیدا کر رہے ہیں بخدا ایسا نہ کر ـــــ بستر پر لیٹے لیٹے کھانستے کھنکھارتے روتے جھینکتے مرنے کے بجائے دشمن کو تہہ تیغ کر کے مر جاؤں۔ دشمن خواہ کسی کا ہو۔ دشمن تو ہے۔ مجھے چوبیس روپیہ آٹھ آنے تنخواہ ملتی ہے!۔ اگر مجھے انچاس روپے ملیں تو میں دو دشمنوں کو مار ڈالوں گا ـــــ مجھے صرف دشمنوں سے نفرت ہے۔ میری تنخواہ بڑھاتے جاؤ۔ خدا کی قسم ایک دشمن کو بھی زندہ نہ چھوڑوں۔

اب جا پیاری۔ میرے بیمار باپ کی تیمارداری کر۔ اس کے غصے کو رفع کرنے کی کوشش کر۔ بیچارے بوڑھے کو زمیندار کے (بدمعاش کانگریسی بیٹے نے کیا الٹا سیدھا سمجھا دیا ہے کہ وہ میرے جنگ پر جانے سے ناخوش ہے ـــــ زمیندار کے بیٹے نے جب سے کھدر کی ٹوپی اور قمیص پہننی شروع کی ہے۔ اس کے سر میں بھی کھدر بھر گیا ہے اس کا دماغ بھی کھدر کی طرح موٹا ہو گیا ہے۔ بڑا آیا اپنے آپ کو وطن کا محافظ کہنے والا ـــــ! ارے اپنے وطن کو بچانا کون سی غیر معمولی بات ہے۔ اپنے گھر کو جب آگ لگتی ہے تو سبھی بجھاتے ہیں مگر بہادری تو یہ ہے کہ دوسروں کے گھروں کو لگی ہوئی آگ بجھاؤ۔ آج تم لندن کو بچاؤ گے تو

کل لندن والے دلّی کو بچائیں گے ـــــ اور کل کا دن شاید طلوع ہی نہ ہو ـــــ ہماری تمدنی زندگی ہم کو یہی سکھاتی ہے ۔

بیوقوف عورت ـــــ میں تجھے کتنا سمجھا رہا ہوں لیکن تو برابر روئے جا رہی ہے ۔ تیرے آنسو رکیں گے بھی کبھی ـــــ ؟ تیری سسکیاں بند بھی ہوں گی ـــــ ؟ ابھی تو میں نہیں مرا ۔ کل جب میری لاش کسی سڑی ہوئی دلدل میں پڑی ہوگی اس وقت تو مجھے کوئی نہیں پوچھے گا ۔ اس وقت کوئی میری لاش پر آنسو بہانے نہیں آئے گا ۔ میں تیرے اُن مکار آنسوؤں کو خوب پہچانتا ہوں ۔

تو پھر پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی ـــــ ! ہونہہ ! تیرے پھوہڑپن ، بدسلیقگی اور بدتہذیبی نے مجھے آخری بار وداع ہوتے ہوئے بھی غصہ دلا دیا ۔ کیا تو مجھے اس طرح بڑبڑاتا ، کڑھتا ، پیچ و تاب کھاتا ہوا رخصت کر دے گی ؟ میں زندگی بھر اسی طرح کڑھتا ، بڑبڑاتا اور غصے سے جھنجلاتا رہا ۔ اب تو چاہتی ہے کہ میں موت کے مُنہ میں بھی مسکراتا نہ جاؤں !

اچھا ـــــ اب میں خفا نہ ہوں گا ۔ اپنے آنسو پونچھ لے بات یہ ہے کہ میں عورت کی آنکھوں میں آنسوؤں کو زیادہ دیر تک دیکھ ہی نہیں سکتا ۔ بوکھلا جاتا ہوں ، جھنجلا جاتا ہوں ۔ اور اسی لیے تو میں لڑائی پر جا رہا ہوں تاکہ تیری آنکھوں میں آنسو کبھی نہ بہنے پائیں ـــــ کون کہتا ہے کہ تیرا سہاگ اُجڑ رہا ہے ۔ سہاگ صرف مرد کی آغوش

ہی ہیں نہیں ہوتا ۔ بلکہ رنگ برنگی چوڑیوں ٗنئی نئی ساڑیوں ٗ مانگ میں بھری ہوئی تازہ افشاں کا نام سہاگ ہے۔ میں تیرے سہاگ کو برقرار رکھنے کے لیے پورے چوبیس روپے آٹھ آنے تیرے نام منی آرڈر کردونگا۔ رنگی برنگی چوڑیاں پہننا ٗ نئی نئی ساڑیاں پہننا ٗ مانگ میں روز افشاں بھرنا ٗ جوڑے میں پھول سجانا ——— میں مر بھی جاؤں تو تیرا سہاگ نہیں مرے گا۔ تجھے پنشن ملا کرے گی ——— اور جب تک پنشن کے روپیوں پر میرے بادشاہ کا چہرہ چمکتا رہے گا۔ تیرا سہاگ زندہ رہیگا میری جان —میرے خدا کے لیے مسکرا ——— یوں نہیں ——— اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھ کر مسکرا — میری جان ٗ میری پیاری ——— ——— ڈارلنگ — !

سُن جہاز کوک رہا ہے۔ تو نہیں مسکرائے گی تو کبھی نہیں مسکرائے گی اچھا اب جا ——— خدا حافظ ——— خدا حافظ ۔

جہاز رینگ رہا ہے۔ میری رفیقہ کا آنسوؤں سے دھندلایا ہوا چہرہ اور بھی دھندلا ہو رہا ہے۔ اب تھوڑی دیر بعد شاید بالکل ہی نہ دکھائی دے۔ کچھ بھی نہ دکھائی دے۔ میں اب کچھ دیکھنا بھی نہیں چاہتا مجھے خوشی ہے کہ میں غلامی ٗ مفلسی ٗ نحوست اور موت کی سرزمین سے ہمیشہ کے لیے جا رہا ہوں۔ اس چور بازار سے جا رہا ہوں جہاں دل میں خوف اور آنکھوں میں گھبراہٹ لیے چھپتا چھپاتا اپنی زندگی کا مول تول کرتا رہا اور قدم قدم پر ایسا محسوس کرتا رہا کہ ابھی دھر لیا جاؤں گا۔ خدا کا

شکر ہے کہ میں اپنی زندگی ہی میں اس چور بازار سے عزت و آبرو سے
جا رہا ہوں۔ ورنہ میری لاش بھی اس ناپاک دھرتی میں دفن کردی جاتی
اور میری روح دھرتی اور آسمان کے درمیان خلاؤں میں تشنہ کام
اور آوارہ بھی بھٹکتی رہتی۔

ناپاک دھرتی ——— اپھ کہتے ہوے میں کیوں لرز گیا۔ کیوں
کانپ گیا۔ نہیں نہیں۔ تو ناپاک دھرتی نہیں۔ تو تو میری ماں ہے۔ تیری
ناپاکی کا باعث میں ہوں۔ تیرا کیا قصور ——— قصور میرا ہے۔ میں
تیرا نوجوان تندرست بیٹا ہوں لیکن ———————————

اے ماں ——— ساحل پر سے تیری بیشمار آنکھیں جھلملاتی مجھے دیکھ رہی
ہیں۔ مجھے خدا حافظ کہہ رہی ہیں اور میں ——— ذلیل کمینہ تجھے چھوڑ کر
جا رہا ہوں۔ چوبیس روپے آٹھ آنے پر میں نے تیری - - - - - -
میں تجھے اپنی مکروہ صورت دکھلانے کے قابل ہی نہیں۔ مجھے کیوں دیکھ رہی
ہیں تیری آنکھیں۔ میری جدائی پر کیوں اداس ہیں۔ میرا مرجانا ہی اچھا ہے۔ سمندر
پھیلتا جا رہا ہے۔ سمندر کو میرے گرد اس طرح پھیل جانا چاہیے کہ میں
پھر کسی دھرتی پر اپنے ناپاک قدم نہ رکھ سکوں۔ دھرتی انسان کے لیے
بنائی گئی ہے۔ انسانی قدموں کے لیے بنائی گئی ہے۔ میں انسان نہیں۔
دنیا میں کوئی بھی انسان نہیں ——— سب درندے ہیں۔ جو انسان کا
بہروپ بنائے وہ سب کچھ کر رہے ہیں جو ایک خونخوار درندہ بھی
کرنے سے ہچکچاتا ہے۔ انسانیت کا نام لیکر انسانوں کو اس کا غلام

بنایا جارہاہے۔ اس کو خریدا جاتاہے۔ بیچا جاتا ہے۔ اس کی عصمت ریزی کی جاتی ہے۔ اور پھر فضاؤں میں رنگ برنگی پھریرے اڑاکر اعلان کیا جاتاہے کہ ہم انسان ہیں ——— !

یہہ ہلکی ہلکی چاندنی اور ڈاک پر جمع ہونے والے مرد عورت' ان کی باتیں' ان کی ہنسی' ان کے قہقہے ان کے گانے کتنے دلنشیں ہیں! ان میں کیسا خلوص اور پیار ہے۔ عورتیں مردوں کی آغوش میں کیسی چمٹی ہوئی ہیں ہونٹوں کے گداز لمس سے یہہ کتنے بیخود ہوے جارہے ہیں۔ لیکن کل ہی پچھ لیعنا... عورتیں ان سینوں سے چمٹ جائیں گی جو فضا میں رنگی برنگی پھریرے اڑائیں گے۔ یہ مرد جو ایک دوسرے سے مسکراکر باتیں کرر ہاہے کل ایسے ہی انسانوں کی گردنیں گاجر اور مولی کی طرح کاٹکر جب مکروہ قہقہے لگائے گا۔ اور جب انسان کے ہاتھ دھرتی کی چھاتی کو لہو لہان کردیں گے۔ اور جب کوئی میرے ننھے ننھے بھائیوں کے ہاتھوں سے ان کی روٹیاں چھین لے گا ———

اور اسے انسان کہا جائے گا! -

میں بھی انسان بننے جارہاہوں۔ کل توپوں کی گرج بم کے دھماکوں تلوار کی جھنکار اور دم توڑتی ہوی چیخوں میں اپنی بندوق پھینک کر انسانی خون میں لت پت پھریرا فضا میں لہراؤں گا تو بینڈ اور باجے خوشی سے چیخنے لگیں گے کہ انسان پیدا ہوگیا ——— انسان پیدا ہوگیا۔

لیکن ساحل پر سے دھرتی کی زرد زرد جھل مل جھل مل کرتی

ہوئی انکھیں جیسے رو رہی ہیں۔ کیوں روتی ہے ماں ——— !
اپنی انکھیں موند لے۔ رات بہت زیادہ ہوگئی ——— میں وعدہ،
کرتا ہوں کہ اب تیرا کوئی دشمن تیری طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھے گا ———
فضا میں خونی پھریرا لہرانے تو دے مجھے —— انسان کے لہو کی ندیاں
تو بہانے دے —— ! اب اپنے نوجوان بیٹے کی محافظت میں آرام
سے سو جا۔ میری ماں ——— پیاری ماں ———
میری سندر ماں —— میں تیرے لیے لوری گاتا ہوں۔
"انسان پیدا ہوگیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ انسان پیدا ہوگیا۔"

تمام شد